اکادمی ادبیات پاکستان
پاکستانی ادب کے معمار
PAKISTAN ACADEMY OF LETTERS
زیتون بانو: شخصیت اور فن
اباسین یوسفزئی

پاکستانی ادب کے معمار

زیتون بانو
شخصیت اور فن

پاکستانی ادب کے معمار

زیتون بانو
شخصیت اور فن

اباسین یوسف زئی

اکادمی ادبیات پاکستان

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

Scanned with CamScanner

نگران اعلیٰ	افتخار عارف
منتظم	ظہیرالدین ملک
تدوین وطباعت	سعیدہ درانی
سکیچ	احمد حبیب
اشاعت	2008
تعداد	500
ناشر	اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع	پوسٹ آفس فاؤنڈیشن پریس، اسلام آباد
قیمت	مجلد:-/230روپے غیر مجلد:-/220روپے

ISBN: 978-969-472-155-2

فہرست

پیش نامہ

اکادمی ادبیات پاکستان نے 1990 میں پاکستانی زبانوں کے ممتاز تخلیق کاروں کے بارے میں "پاکستانی ادب کے معمار" کے عنوان سے ایک اشاعتی منصوبے پر کام شروع کیا تھا۔ معمارانِ ادب کے احوال و آثار کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لیے یہ کتابی سلسلہ بہت مفید خدمات انجام دے رہا ہے۔ اکادمی، پاکستان کی تمام زبانوں کے نامور ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں اور نقادوں کے بارے میں کتابیں شائع کر رہی ہے۔

زیتون بانو پشتو اور اردو کی ممتاز افسانہ نگار، ناول نگار، ڈرامہ نگار، شاعرہ اور ترجمہ نگار ہیں۔ وہ نصف صدی سے بھی زیادہ عرصے سے تسلسل کے ساتھ لکھ رہی ہیں۔ مرد کی بالادستی کے حامل معاشرے میں ایسی کمٹ منٹ کے ساتھ کسی خاتون کا جم کر کھڑے رہنا یقیناً بڑے حوصلے کی بات ہے۔ پاکستان، خاص طور پر سرحد کی معاشرت میں خواتین کی حقیقت پسندانہ ترجمانی کے حوالے سے زیتون بانو کا بڑا کام ہے۔ بلاشبہ انہوں نے پشتو کے ساتھ ساتھ اردو ادب کو بھی بے حد ثروت مند بنایا۔

پیشِ نظر کتاب "زیتون بانو: شخصیت اور فن" معروف ادیب اباسین یوسفزئی نے اکادمی ادبیات پاکستان کے لیے تحریر کی ہے جو زیتون بانو کی شخصیت اور فن سے متعارف کرانے اور ان کے کام کو سمجھنے میں یقیناً معاون ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان کا اشاعتی منصوبہ "پاکستانی ادب کے معمار" ادبی حلقوں کے علاوہ عوامی سطح پر بھی پسند کیا جائے گا۔

افتخار عارف

پیش لفظ

تحقیق وتنقید ایک دقیق، توجہ طلب اور حوصلہ فرسا کام ہے۔ بات میں تحقیقی توانائی اور کام میں جان ڈالنے کے لئے داخلی اور خارجی شہادتوں کا حصول ایک صبر آزما اور تھکا دینے والا سلسلہ ہوتا ہے۔ تخلیقی ادب میں اعصاب شکن مراحل آتے ہیں جبکہ اس کے برعکس تحقیقی وتنقیدی ادب میں بال کی کھال نکالنا پڑتی ہے۔ بڑے تھکا دینے والے کٹھن مراحل سے گذرنے کے بعد کہیں جا کے بات بنتی ہے۔

محترمہ سعیدہ درانی نے جب مجھے پشتو ادب کی خاتون اول میرمن (محترمہ) زیتون بانو کے فن اور شخصیت کے بارے میں کتاب لکھنے کی دعوت دی تو میں شدید مصروفیت کے باوجود انکار نہ کر سکا اور بغیر سوچے سمجھے حامی بھر لی۔ اس کے پیچھے دو باتیں کارفرما تھیں۔ پہلی تو یہ کہ بانو جی کی ذات سے میری والہانہ عقیدت اور دوسری بات پشتو ادب کے لئے ان کی گراں قدر خدمات۔

جب زیتون بانو نے ادبی دنیا میں قدم رنجہ فرمایا تو اس وقت تک ادبی دنیا میں کسی خاتون نے مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے کا سوچا تک نہیں تھا۔ بیسویں صدی میں محترمہ قانتہ بیگم، الفت بیگم درد، س ب ب اور گنتی کے چند نام قابل ذکر ہیں لیکن ان سب میں محترمہ زیتون بانو کئی حوالوں سے معتبر ٹھہریں۔ انہوں نے نہ صرف عالمی معیار کا ادب تخلیق کیا بلکہ مردانہ وار ادبی تحاریک اور محافل کا حصہ ہیں۔ ان کے حالات زندگی پڑھ کر میرے دعوے کی صداقت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ گذشتہ ستر سالہ تجربات اس سونے کو کندن بناتے رہے۔ ان کی ذات کا ہر حوالہ ان کے بعد آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ ہے۔

اس کتاب میں ان کی حیات وخدمات کے ہر گوشے تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر

پھر بھی دنیا میں کوئی چیز مکمل نہیں ہوسکتی۔ خصوصاً تحقیق میں کوئی حوالہ بھی حرفِ آخر نہیں ہوتا۔ بانوؒ
حیات وخدمات کا سلسلہ ستر سال پر محیط ہے۔ کچھ ترمیم کے ساتھ شاعر کا یہ مصرعہ کارآمد ہوسکتا ہے۔

یہ نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں اپنے دوستوں کے ساتھ ساتھ محترمہ سعیدہ درانی اور صدرِ
اکادمی ادبیات جناب افتخار عارف کے مشوروں اور رہنمائی کا بے حد شکر گذار ہوں۔ اور بانو جی کا شکر
نہ ادا کرنا سراسر ناانصافی ہوگی۔ شکریہ

اباسین یوسف زئی

معمار ادب "زیتون بانو"

پیدائش :

محترمہ زیتون بانو پشاور میں 18 جون 1938ء کو سپینہ وڑیٔ گاؤں میں پیدا ہوئیں۔ سپینہ وڑیٔ کو غلط ام کر کے "سفید ڈھیری" کہا جاتا ہے۔ سرکاری کاغذات میں بھی سفید ڈھیری درج ہے۔ محترمہ بانو ید ڈھیری نام سے اتفاق نہیں کرتیں۔ ان کا موقف ہے کہ دوچشمی "ھ" کی ادائیگی عام طور پر پشتون ت نہیں کر سکتے۔ سفید ڈھیری کی بجائے سفید ڈیری یا سپید ڈیری کہیں گے۔ اگر کہنا ہو" آئینے کھانا ہائے" تو پشتون کہے گا" آیئے کانا کایئے"۔ لہٰذا "ڈھیری" لفظ ایک پشتون گاؤں کے ساتھ لگانا سب نہیں ہے۔

1913ء سے ذرا قبل کی بات ہے کہ صوابی کے سر صاحبزادہ عبدالقیوم نے اسلامیہ کالج پشاور کا سوبہ بنایا۔ جہکال سپینہ وڑیٔ اور آس پاس کے دیہات کے باشعور، صاحب دل لوگوں نے اس مقصد کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے اپنی زمینیں بخوشی دے دیں۔ کافی مالی معاونت بھی کی جن کی استطاعت تھی انہوں نے چندہ جمع کرنے کی مہم میں ہاتھ بٹایا۔

اسلامیہ کالج پشاور اور یونیورسٹی آف پشاور انہی گاؤوں کے دامن میں ہیں۔

آباؤ اجداد:

محترمہ زیتون بانو کا تعلق سپینہ وڑیٔ کے بخاری سادات خاندان سے ہے جس کا ہر فرد پیر کہلاتا ہے اور ...ا لکھا ہوتا ہے۔

زیتون بانو پیر سید عبدالقدوس تندر کی پوتی اور ان کے بڑے بیٹے پیر سید سلطان محمود شاہ کی صاحبزادی ہے۔

پیر عبدالقدوس تندر اپنے وقت کے مشہور انقلابی شاعر اور ادیب تھے۔ ان کی سیاسی، سماجی اور ادبی مصروفیات کا دائرہ خاصا وسیع تھا۔ بڑے پیر صاحب ایک شعلہ بیان مقرر، حقیقت پسند نقاد اور انقلابی ادیب وشاعر کی حیثیت سے بھی جانے پہچانے جاتے تھے۔ تندر صاحب نے صحافت کے میدان میں بھی کافی خدمات انجام دیں اور ایک سیاسی انقلابی اخبار ''انگار'' کی ادارت بھی کی۔

یہ سن 31-1930ء کا زمانہ تھا جب ''انگار'' میں انقلابی نظم ونثر چھپا کرتی تھیں جن میں انگریز سے نفرت اور انگریز کو اس ملک سے نکالنے کی باتیں ڈھکی چھپی اور برملا انداز میں بیان کی گئی ہوتی تھیں۔ استعماری قوت سے یہ کب برداشت ہوتا تھا؟ چنانچہ کچھ عرصہ بعد ''انگار'' اخبار بند ہوا۔ اخبار کے کار پردازوں کو پابند سلاسل کیا گیا جن میں پیر عبدالقدوس تندر بھی شامل تھے۔ تندر صاحب کو چار سال قید ہوگئی تھی۔

''انگار'' اخبار کی ادارت جب تندر صاحب کو سونپی گئی تو ان سے پہلے غالباً ولی محمد طوفان صاحب اخبار کے ایڈیٹر رہے ہوں گے تب ہی تندر صاحب نے کہا تھا۔

دوران لاړو د طوفان پرې باندی تپر شو
په انګار باندې اوس وارد تندرراغے

ترجمه:

طوفان کا زمانہ گذر چکا۔ اب انگار اخبار پر تندر کا دور آیا ہے (تندر پشتو زبان میں آسمانی بجلی یا برق کو کہتے ہیں)

جب سے تندر صاحب انگریز کے زیر عتاب آئے تھے ایسی افواہیں پورے گاؤں میں پھیلی ہوئی تھیں کہ پیر صاحب کی زمین و جائیداد بحق انگریز سرکار ضبط ہونے والی ہے۔ چنانچہ موصوف نے قید سے چھٹتے ہی ساری زمینیں اونے پونے بیچ ڈالیں اور موقع پاتے ہی بیوی بچوں سمیت افغانستان ہجرت کر گئے۔ اس زمانے میں پنجاب کے اکا دکا اور صوبہ سرحد کے بیشار لوگ مہاجروں کی صورت میں افغانستان سدھار گئے تھے تاکہ کھلے بندوں وہاں سے اپنے وطن کی آزادی کے واسطے جدوجہد جاری رکھ سکیں۔

افغانستان کے حکمران (غالباً امیر امان اللہ خان) نے مہاجرین کو کچھ مراعات بھی دی تھیں چنانچہ پیر عبدالقدوس تندر کو بھی کچھ خیمے، چند ضروریات زندگی اور مزار شریف میں تھوڑی بہت زمین بھی دی گئی۔ تندر صاحب نے اپنے بیٹوں کی معیت میں زمین پر کام شروع کیا مگر اپنے مشن سے دست بردار نہ

ئے۔شنید ہے کہ برصغیر پر قابض استعماروں نے جانے کیا کیا پینترے بدلے کہ مہاجرین کو مقامی
لوں نے دق کرنا شروع کیا۔ جہاں جہاں مہاجرین کے خیمے استادہ ہوتے وہاں پانی چھوڑ دیا جاتا اور
مشہور کرتے یہ سیلابی پانی ہے۔مزید حربوں سے بھی مہاجرین کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔لہٰذا کئی خاندان
افغانستان سے واپس لوٹے۔تندر صاحب اوران کا خاندان بھی ایسے لوگوں میں شامل تھا۔

جب تندر صاحب بمعہ اہل وعیال افغانستان سے نکلنے پر مجبور ہو کر پشاور واپس آئے تو پتہ چلا کہ سیر کی کتنی پکتی ہیں۔ساری جائیداد چونکہ بیچ دی گئی تھی۔رہنے کا ٹھکانہ بھی نہیں تھا۔عزیز واقربا نے مکان دینے کی پیشکشیں کیں مگر تندر صاحب نے کسی کے احسان تلے دبنا نہیں سیکھا تھا۔ایک دو کا دو کمروں کا مکان 5 روپے ماہانہ کرائے پر لے کر اس میں رہنے لگے۔دونوں بڑے بیٹے سلطان محمود شاہ اور قطب شاہ چونکہ شادی شدہ تھے وہ عزیزوں سے مانگے ہوئے مکانوں میں رہنے پر مجبور ہوئے۔

دونوں بھائی ملازمت کی تلاش میں مارے مارے پھرتے پھراتے آخر سڑکوں پر کول تار بچھانے کی بیہاڑی پر لگ گئے۔ماں باپ اور چھوٹے بہن بھائیوں کا بوجھ بھی کندھوں پر آن گرا تھا۔کسی پکی نوکری کی تلاش جاری تھی مگر لا حاصل کہ باپ ہنوز قلم اور زبان سے آزادی کی جنگ میں مصروف تھے جس کی سزا پڑھے لکھے بچے بھگت رہے تھے بچوں کو ساری عمر اس کا قلق رہا۔

یہ پاکستان بننے کے بعد کی بات ہے۔دوسرے بچے بھی اس وقت موجود تھے۔ملکی حالات زیر بحث تھے۔بڑے بیٹے نے ازراہِ مذاق یہ سچ اگل دیا۔

"بابا۔۔۔۔آپ صحیح معنوں میں تندر (برق) ثابت ہوئے۔گرے بھی تو اپنی اولاد اور خاندان کے مستقبل پر۔"

"خبیثو!! اگر ہم نے آزادی کی جنگ نہ لڑی ہوتی تو کیا تم ریڈیو جیسے حساس ادارے میں اتنے بڑے عہدے پر فائز ہوتے؟نہیں! یہاں کوئی انگریز تمہاری کرسی پر بیٹھا ہوتا اور تم اس کے چپڑاسی ہوتے۔تیرا بھائی سید شریف بھی فوج میں کرنیل کی بجائے کسی دفتر میں بابو ہوتا یا۔۔۔۔۔۔۔"

پیر عبدالقدوس تندر کی اولاد میں چھ بیٹے اور دو بیٹیاں شامل تھیں ان کے نام کچھ یوں ہیں۔

1۔ پیر سید سلطان محمود شاہ۔اسسٹنٹ سٹیشن ڈائریکٹر ریٹائر ہوئے تھے۔

2۔ پیر سید قطب شاہ۔ واپڈا میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔

3۔ پیر سید اکبر شاہ۔ خیبر میڈیکل کالج پشاور یونیورسٹی میں لائبریرین تھے۔ جنیوا سے ٹریننگ لی تھی۔

4۔ پیر سید حبیب شاہ۔ فوج کی نوکری چھوڑنے کے بعد جناح کالج فار ویمن یونیورسٹی آف پشاور میں برسر تھے۔

5۔ پیر سید شریف شاہ۔ پاک فوج میں کرنل کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے۔ ٹرپل ایس بخاری کے نام سے بھی مشہور تھے۔

6۔ سید نظیف شاہ۔ بجلی کے محکمے سے سپرنٹنڈنٹ ریٹائرڈ ہوئے۔

دو بیٹیاں گلفامیہ اور مطلعہ تھیں جواب حیات نہیں ہیں۔ ان کے علاوہ پیر صاحب کی ایک بیٹی اور دو بیٹے شیر خوارگی میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ پیر سید عبدالقدوس تندرؔ نے اپنے بڑے بیٹے سید سلطان محمود کی وفات سے صرف تین ماہ بعد 113 برس کی عمر میں 1976ء میں وفات پائی۔ بیٹے کی وفات کا صدمہ برداشت نہیں کر سکے تھے۔

شجرۂ نسب

پیر سید ابراہیم شاہ
پیر شاہ مان دیکہ (پیر سید امان شاہ)
پیر نبی شاہ
پیر سید عبدالقدوس (تندر)
پیر سید سلطان محمود شاہ
پیر سید قطب شاہ
پیر سید اکبر شاہ
پیر سید حبیب شاہ
پیر سید شریف شاہ بخاری
پیر سید نظیف شاہ
دو بیٹیاں
ایک بیٹا سلیم شاہ
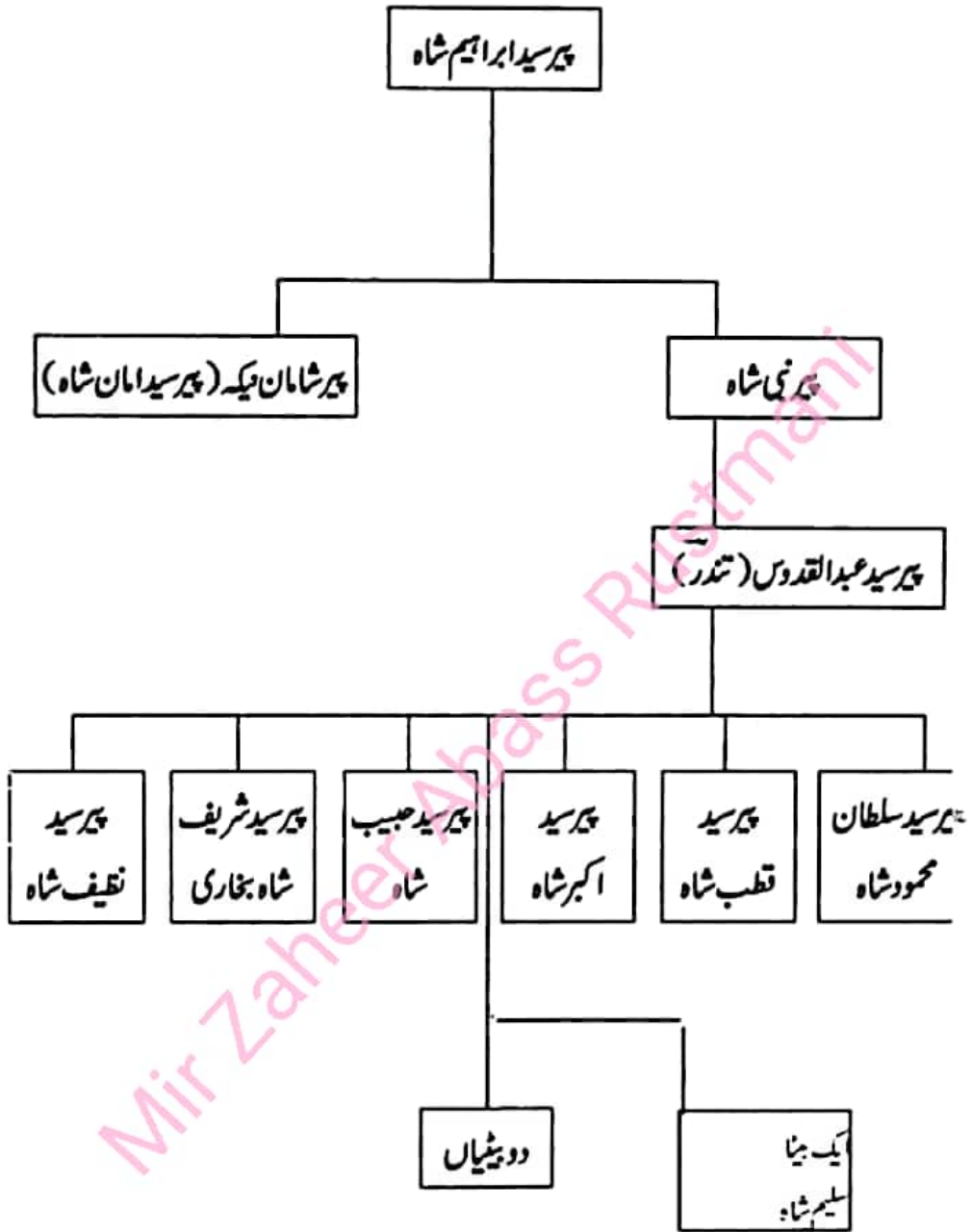
پیر سید سلطان محمود شاہ یعنی زیتون بانو کے والد نے 18 فروری 1913ء کو آنکھ کھولی اور 14 جنوری 1976ء کو اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ وہ ریڈیو پاکستان پشاور میں پہلے انجینئر کے عہدے پر کام کرتے رہے اور بعد میں اسسٹنٹ سٹیشن ڈائریکٹر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

موصوف نے موسیقی اور سائنس کے بارے میں پشتو زبان میں بے شمار مضامین لکھے جو "جمہوریت" اور "جمہور اسلام" میں چھپتے رہے اور ریڈیو پاکستان کے پشاور سٹیشن سے بھی نشر ہوئے۔ ریڈیو اور سٹیج کے لئے صداکاری اور اداکاری بھی کی۔ اسلامیہ کالج پشاور کے خیبر یونین ہال کے سٹیج پر آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے "خوب صورت بلا" کو سٹیج کی زینت بنانا پیر سلطان محمود کی کاوشوں کا مرہون منت تھا۔ یہ ڈرامہ اسلامیہ کالج کے ملازمین، ان کی بیگمات اور بچوں نے بھی دیکھا تھا جو تین راتیں متواتر پیش کیا گیا۔ یہ کوشش بہت سراہی گئی۔ پیر صاحب نے خاصا نام کمایا۔ ڈرامے میں طغرل کا رول موصوف نے خود ادا کیا تھا۔

گویا والد کی طرف سے زیتون بانو کو فنکاری وراثت میں ملی۔ باپ دادا کے علاوہ زیتون بانو کے خاندان میں اور بھی صاحب قلم لوگ موجود ہیں۔ ان کے ایک چچا پیر قطب شاہ مرحوم صاحب کتاب تھے۔ ان کے شعری مجموعے کا نام "دپیر کرامات" (پیر کی کرامات) ہے۔ نامور شاعر، افسانہ نگار قلندر مومند دور کے رشتے میں بانو کے چچا لگتے تھے۔ پشاور ٹی وی کے معروف اداکار ریڈیو کے صداکار سید ممتاز علی شاہ آپ کے عزیزوں میں شامل ہیں۔ ممتاز علی شاہ بھی بہت اچھے شاعر ہیں ممتاز تخلص رکھتے ہیں مگر اپنی شاعری بے تکلف دوستوں کی محفلوں تک محدود رکھی ہوئی ہے۔ شاعری میں متانت اور سنجیدگی کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ مگر انہوں نے اصل نام فن اداکاری میں کمایا اور صدارتی ایوارڈ تمغہ حسن کارکردگی حاصل کیا۔

خماد ژوند سرمایه فن دے زه به اوشیندم پرې
که مې ترغور وشوې دقام دودانئ سندرې
ممتازه شور سپدے مرام ته چرې نه شو
تر څو چې هېرې نکړو مونږ دخان خانئ سندرې

ترجمہ:

میری زندگی کا سرمایہ فن ہے اپنا فن اس پر نثار کرلوں گا اگر کسی نے میرے کان میں قوم کی سربلندی کے نغمے سنائے۔

ممتاز! ہم اپنی منزل تک تب پہنچیں گے جب اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کے گن گانا چھوڑ دیں گے۔

ممتاز علی شاہ کے علاوہ بانو کا ایک اور کزن ظفر زہیر بھی شاعری میں درک رکھتے ہیں۔

بچپن :

بچپن کے حوالے سے زیتون بانو نے بتایا۔

''میرے بچپن کا زیادہ حصہ میرے گاؤں سپینہ درئ کی گلی کوچوں، کھیتوں اور یہاں کے چھتنار درختوں کی شاخوں اور ٹہنیوں پر گزرا۔ درختوں پر پرندوں کے انڈے یا بچے ڈھونڈا کرتی تھی۔ کبھی انڈا توڑا اور نہ ہی کسی پرندے کے چوزے کو کوئی گزند پہنچائی''۔

میرے بچپن کے زمانے میں بارشیں بہت برسا کرتیں تھیں۔ ژالہ باری بھی بہت ہوا کرتی۔ آندھی طوفان بھی آیا کرتے۔ جس رات کوئی طوفان آیا۔ سپیدۂ سحر پھیلتے ہی ان درختوں تک پہنچتی جن میں دن بچے دیکھے ہوتے۔ نیچے گرے ہوئے چوزوں کو اٹھا کر واپس گھونسلوں میں رکھ آتی۔ معلوم نہیں کس گھونسلے کا بچہ کون سے گھونسلے میں کھیرا ہوتا۔ دن کے وقت طوفان آندھی بارش کی صورت میں کام نسبتاً آسان ہوتا۔ مگر طوفانی رات میں والدین کے خوف سے گھر سے باہر نکلنے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا بلکہ میرے بس سے باہر تھا لیکن ایسے میں پرندوں کے دکھ میں ساری رات جاگ کر آنسو بہانا میرے اپنے اختیار میں ہوتا تھا۔ چنانچہ چھپ چھپ کر آنسو بہاتی۔ دوسرے دن ماں جنہیں ہم ''مور جان'' کہہ کر پکارتے تھے خوب جھاڑتیں۔ برا بھلا کہتیں۔

''رات کو پھر خصم کے سیاپے کئے!! جو اتنے آنسو بہائے ہیں سارا تکیہ بھیگ چکا ہے۔''

محترمہ زیتون بانو نے اپنے بچپن کی کچھ اور باتیں اور یادیں بھی ہمارے ساتھ شیئر کیں۔ میرمن بانو کو لڑکوں والے کھیل کھلونے بالکل بھی نہیں بھاتے تھے۔ وہ بنٹے، غلیل، کبڈی، آنکھ مچولی جیسے کھیلوں میں دلچسپی لیتیں۔ ان کی صرف ایک اکلوتی سفید لٹھے کی بنی ہوئی گڑیا تھا۔ جس کے گلے میں ایک بڑا سا دھاگے میں پیرو یا ہوا پڑا رہتا وہ گڑیوں کی ڈاکٹرنی تھی۔ بانو نے اس کا نام ''باگی ملو'' رکھا تھا۔ بانو کی سہیلیوں میں سے کسی لڑکی کی گڑیا جب بیمار پڑتی تو ''باگی ملو'' کے پاس لے آتی اور بھلی چنگی ہو جاتی۔

بانو کو یہ گڑیا ماں نے بنا کر دی تھی جس کی آنکھیں نیلے رنگ کے ریشم سے بنائی گئی تھیں۔ مگر بانو کو نیلی آنکھیں پسند نہیں تھیں چنانچہ ایک روز بانو نے خود ہی نیلی آنکھیں نوچ کر کالے دھاگے سے گڑیا کی

آنکھیں بناڈالیں۔ ''مورجان'' کودکھائیں تو وہ بہت خوش ہوئیں کہ ان کی ''لڑکا بٹی'' سوئی دھاگے کا کام جانتی ہے۔

میرمن زیتون کی والدہ ''ام کلثوم'' اردو اور پشتو لکھ پڑھ سکتی تھیں۔ وہ کسی باقاعدہ سکول مدرسہ سے پڑھی نہیں تھیں۔ بوستان، گلستان اور پنج کتاب اپنے والد سے پڑھ کر فارسی سیکھی تھی۔ عام بول چال میں فارسی کے اشعار ضرب الامثال کے طور پر استعمال کیا کرتیں۔ اردو تھوڑی بہت اپنے ماموں زاد پیر فضل رحیم شاہ سے پڑھی مگر کچھ عرصہ بعد نانا نے نواسے کو منع کیا کہ ''اب تم بڑے ہو چکے ہو آئندہ ہمارے گھر میں بغیر آواز دیئے مت آیا کرو۔''

محترمہ باَنو کے والد کا تبادلہ جب کراچی ہوا تھا تو ماں اپنی بیٹیوں ''بانوگئی'' اور تاَرو کو نظم کی زبان میں خط لکھا کرتیں۔ ''بانوگئی'' زیتون بانو اور تاَرو چھوٹی بہن مختار بیگم کے اسم تصغیر ہیں۔

قریبی رشتہ دار انہیں ''بانوگئی'' کے نام سے بلاتے ہیں سید تقویم الحق کا کاخیل مرحوم و مغفور بھی باَنو کو ''بانوگئی'' کہتے تھے۔ ان کو تقویم الحق صاحب نے بھتیجی کا درجہ دیا تھا۔

میرمن باَنو کا اکلوتا بھائی پیر سید سلیم شاہ بخاری ریڈیو پاکستان سے نیوز ایڈیٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ اپنی تحریر پر سلیم بخاری نام دیتے تھے ان کا ایک افسانہ ''خانئی'' بہت مشہور ہوا تھا۔ شہرت کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ''خانئی'' گھر کی پالتو بلی تھی جو بہت خوب صورت اور ذہین تھی اور چمینا سے بڑا پیار کرتی تھی (چمینا سلیم شاہ کی کنیت تھی)

سلیم شاہ بخاری 24 مارچ 2004ء کو داغ مفارقت دے گئے۔ دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ بھائی کی موت کے بعد زیتون باَنو کافی عرصہ سخت ذہنی دباؤ کا شکار رہیں۔

باَنو کے ساتھ بچپن میں دو چار ایسے واقعات بھی پیش آئے جو کسی بڑے حادثے کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتے تھے مگر قسمت یاوری کرتی اور وہ بچ جاتیں۔

باَنو اپنے گاؤں اور گاؤں سے باہر کھیتوں کھلیانوں میں ہر درخت کی رگ رگ سے واقف تھیں۔ ان کو معلوم تھا کہ پن چکی والی بڑی ندی کے کنارے شیشم کا جو پرانا بڑا سا اونچا درخت کھڑا ہے اس کی کھوہ میں میناؤں کے نیلے چتری رنگ کے انڈے پڑے ہیں۔ باَنو کے اندازے کے مطابق ان انڈوں سے بچے نکل آئے ہوں گے درخت پر چڑھی میناؤں کے بچے دیکھنے کے لئے جونہی باَنو نے کھوہ میں جھانک کر دیکھا۔ یہ بڑا سا موٹا سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ سانپ پھن اٹھا کر باَنو پر پھنکارا۔ باَنو نے آؤ دیکھا نہ

تاؤ۔درخت سے نیچے چھلانگ لگادی۔قسمت اچھی تھی باؔنو سیدھی ندی میں آگری۔اس وقت پانی کا بہاؤ بھی زیادہ تھا۔بہاؤ کے ساتھ کچھ دور تک بہتی چلی گئی دو چار غوطے کھائے۔ندی کنارے اُگی گھاس پھونس کا سہارا لیا۔باہر نکلی اور گاؤں کی طرف بھاگی۔

ایک دفعہ دوسرے دن عید تھی۔''بانوگئی'' کی ''مور جان'' نے کہا۔

''خه کنه بیزو گی، دتوت پانی راوړه چې نکریزې درله
پورې کرم. په سپینو لاسو پنبو خوشحالی خوند نه
کوی. سبا اختر دے''

ترجمہ:

جاؤ نا بندریا! شہتوت کے پتے توڑ لاؤ۔تمہیں مہندی لگاؤں۔سفید ہاتھ پیروں سے خوشی مزہ نہیں دیتی۔کل عید ہے۔

چنانچہ باؔنو نے ایک درخت کا انتخاب کیا۔پتے توڑتی توڑتی وہ کافی اونچائی تک چڑھی۔ابھی ایک ٹہنی پکڑ کر اپنی طرف کھینچ ہی رہی تھی کہ بھڑوں کے ایک بڑے سے چھتے کی بیسیوں بھڑوں نے باؔنو پر حملہ کیا۔چیختی چلاتی زمین پر آرہی۔دوسرے دن عید تھی۔ماں کی لاڈلی ''بانوگئی'' کے ہاتھ، چہرہ اور سر سوج کر کپا ہو گئے تھے۔جن پر مہندی کی لالی کی بجائے بھڑوں کے زہر کی سرخی چڑھی ہوئی تھی۔

1944-45ء کا زمانہ تھا۔گوروں کی حکومت تھی۔ان کے فوجی دستے گشت کے دوران بانو کے آبائی گاؤں سپینہ وڑئ سے بھی گزرا کرتے تھے مگر بانو نے ان کے چہروں پر نظر بھر کر کبھی نگاہ نہیں ڈالی تھی کہ ''ادے جان'' (دادی) نے سختی سے منع کیا تھا کہ کسی گورے کو دیکھنا بڑا سخت گنا ہوتا ہے۔''بابا جی'' (دادا) انگریزوں کو جب بھی کوسنے دیتے جانور کے نام سے یاد کرتے۔ایسے گھریلو ماحول کی پروردہ بانوگئی کے دماغ میں یہ باتیں راسخ ہو چکی تھیں۔یہاں تک کہ یہ بچپن میں کافی عرصہ سفید چمڑی والے انگریزوں کو ایسے انسان سمجھتی رہی جن کے کھر ہوں اور کھروں کے نیچے گھوڑوں جیسی نعلیں لگی ہوں۔

ایسے ہی ایک گشت کے دوران کسی دیہاتی بچے نے غلیل سے کس کر ایک پتھر ایک گورے فوجی کے دے مارا۔اتفاق سے باؔنو اس وقت دیوار کی اوٹ لے کر غلیل ہاتھ میں لئے کھڑی تھی۔معلوم نہیں ولی الرحمٰن نامی لڑکے نے کس بنا پر باؔنو کی طرف اشارہ کیا۔گورے فوجی نے آگے بڑھ کر باؔنو کو بازو سے پکڑا اور دھکا دیا۔وہ گری ابھی سنبھل کر اٹھی ہی تھی کہ باؔنو کی گال پر ایک زوردار چانٹا پڑا وہ بتا رہی تھیں۔

''میں آج بھی اکثر اپنی بائیں گال پر اس گورے کے تھپڑ کی جلن محسوس کرتی
ہوں۔تب سے اب تک سفید چمڑی والے جس غیر ملکی سے کبھی ملی ہوں۔بات
چیت بھی کی ہو گی مگر اس کا ناک نقشہ کبھی یاد نہیں رہتا۔''

محترمہ زیتون بانو نے ایک موقع پر بتایا۔

ہماری ''مور جان'' (والدہ) کا دستور تھا کہ مجھ سے یا سلیم شاہ (بھائی) سے جو نماز بھی چھوٹ جاتی چائے کھانا بند کر دیا جاتا۔ اکثر رات کو بھوکے رہتے۔بھوک ہماری نیندیں دور کہیں اڑا جاتی۔ماں کے لیٹ جانے کے تھوڑی دیر بعد ہم دونوں چپکے سے اٹھ کر کھانا کھا لیتے۔''مور جان'' کو پتہ چل بھی جاتا تو وہ چپکی پڑی رہتیں۔غالباً یہ ہماری پنجگانہ نماز کی ادائیگی کی ٹریننگ تھی جس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی رہیں۔

اسلامیہ کالج کی رہائش کے زمانے میں ایک روز کھیلتے کھیلتے بچوں نے پروگرام بنایا'' چلو بھٹے توڑتے ہیں'' سب بچے جھولیاں بھر بھر بھٹے توڑ کر گھروں کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔بانو نے ایک بھٹے کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر بھٹے کا ڈنٹھل بل کھا گیا۔جتنی کوشش کرتی بھٹہ مزید بل کھاتا جاتا۔اس نے جلدی میں بھٹہ چھیلا اور چھلا ہوا بھٹہ لے کر بھاگی۔مگر اب گھر کیسے جائے؟؟''مور جان'' وہ پٹائی کریں گی کہ قیامت تک یاد رہے گی اور قیامت میں اللہ کو کیا جواب دے گی؟اس کی نیکیاں ہی کتنی ہوں گی جو اتنے بڑے بھٹے کے عوض کھیت کے مالک کو دے سکے گی؟اس ادھیڑ بن میں کھیت کی طرف واپس گئی۔بھٹہ دھاگے سے اس کے چھلکوں میں واپس باندھ آئی اور اس طرح چوری کے ارتکاب سے اپنے طور پر مبرا ہو گئیں۔

اسلامیہ کالج آ کر بانو کو پتہ چلا کہ یہاں کے پودے،درخت زیادہ سرسبز وشاداب ہیں۔اونچے گھنے تناور درخت کی شاخوں پر اب وہ اکیلی بیٹھی سوچا کرتی۔اس نے جانا کہ کسی گھنے بڑے درخت کے سائے تلے اُگے پودے زیادہ نہیں پنپتے۔اس کا سائنسی اصول اسے بعد میں معلوم ہوا اور۔۔۔یہ عقدہ بھی کھلا کہ مشہور والدین کی اولاد ماں باپ جیسی شہرت کیوں نہیں پاتی؟

بہت سالوں بعد ایک بار سید قاسم محمود صاحب تاج سعید اور بانو کے ہاں مہمان ٹھہرے ہوئے تھے۔ادبی باتیں ہو رہی تھیں۔بچے بھی بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے اچانک بچوں کو مخاطب کیا۔

''مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ چاروں بہن بھائی اخبار،رسالے اور کتابیں پڑھنے

کے بڑے شوقین ہیں۔کیا آپ بھی ماں باپ کی طرح بننا چاہتے ہیں؟؟؟؟
''بڑی بیٹی افشاں بولی''نہیں انکل''۔قاسم محمود صاحب حیران ہوئے۔''کیوں
''؟؟افشاں نے بتایا''داجی''اور''امی'' گھنے،تناور اور پھلدار درختوں کی مانند
ہیں اور ہم ان کی چھاؤں میں پل تو رہے ہیں۔مگر پھلدار درخت بن کر ان سے
آگے شاید ہی نکل سکیں اور پھر ادب کے میدان میں تو کبھی بھی نہیں۔۔۔۔''

اس پر ایک اور واقعہ یاد آیا جو بانو صاحبہ نے بڑے کرب سے بتایا۔

یونیورسٹی آف پشاور میں ایم اے کلاسز میں داخلہ ٹیسٹ ہو رہے تھے۔بانو اپنی بیٹی افشاں بانو کو اسلامک سنٹر پہنچا کر خود پشتو اکیڈیمی آ گئیں۔نواز طائر صاحب کو معلوم ہوا کہ بیٹی اسلامک سنٹر میں انٹری ٹیسٹ دے رہی ہے۔طائر صاحب نے مشورہ دیا کہ آج پشتو ایم اے کے لئے بھی ٹیسٹ ہو رہا ہے بیٹی کو یہاں داخلہ کیوں نہیں دلوا دیتی؟؟

بانو صاحبہ بھاگم بھاگ بیٹی کے پاس پہنچیں مگر بیٹی نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

''امی!! آپ خود پبلک سکول کے پرائمری سیکشن میں ٹوٹوز آر فور۔۔۔ٹوتھریز آر سکس پڑھا رہی ہیں جبکہ آپ کی کتابیں پشتو ایم۔اے کے سلیبس میں کئی سال سے شامل ایم اے لیول پر پڑھائی جا رہی ہیں۔آپ کے افسانوں،آپ کی شاعری،آپ کی شخصیت پر پیپرز لکھے جا رہے ہیں ریسرچ کا کام ہو رہا ہے۔ آپ نے پشتو ایم اے کر کے یہ پھل پایا ہے کہ پرائمری سیکشن کی ایک عام ٹیچر ہیں۔آپ کو پشتو سے کیا ملا؟ یہ کڑوا پھل مجھے کھانے پر مجبور مت کریں امی !!۔۔۔''اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ماں نے آگے بڑھ کر بیٹی کی پیشانی چومی مگر اس کی اشک شوئی نہیں کی کہ اس نے ایک تلخ حقیقت بیان کی تھی جس کا تلخابہ بانو نے اپنے سراپا میں تحلیل ہوتے محسوس کیا۔مگر جو چرکہ ان کی روح کو لگا تھا اس کا زخم وہ آج تک خاموشی سے چاٹ رہی ہیں یہ 1986ء کا واقعہ تھا''۔

میرمن بانو بتاتی ہیں کہ وہ اکثر خواب مین کسی ماہر پرندے کی مانند آسمان کی وسعتوں میں محو پرواز ہوتیں۔اڑان بھرتے ہوئے نہ انہیں کوئی خوف محسوس ہوتا نہ ڈر۔۔۔وہ کافی اونچائی پر اڑتیں اور عجیب عجیب جگہوں کی سیریں کرتی پھرتیں۔گویا بقول ناصر علی سید:

فلک پر ہوں تو مجھ پر طنز مت کر
زمین تیرا ستارہ ڈھونڈتا ہوں

بانو صاحبہ نے مزید بتایا کہ ہر مشہور شخصیت کی موت سے پہلے وہ خواب میں ایک ہوائی جہاز زمین پر گرتے دیکھا کرتیں۔ ان شخصیات میں قائداعظم محمد علی جناحؒ، لیاقت علی خان، سردار عبدالرب نشتر، ڈاکٹر خان صاحب، گاندھی جی، اندرا گاندھی، شاستری، راجیو گاندھی، وغیرہ شامل ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو کے لئے ایک بڑا سا بحری جہاز، ایک بڑی سی خاموش پانی کی جھیل میں ڈوبتے دیکھا تھا۔

محترمہ بانو نے مسکراتے ہوئے کہا:

ایک رات خواب میں دیکھا کہ میرا نکاح قائداعظم محمد علی جناحؒ سے ہو رہا ہے اور میں بڑی خوش ہوں۔ ڈر کے مارے یہ خواب سال ڈیڑھ تک کسی کو نہیں بتایا۔ جب بھی بیمار پڑی سمجھ بیٹھی کہ اب کے رخت سفر باندھا کہ باندھا۔

''ایک روز میری سہیلی رضیہ خانم مجھے اپنے سکول لے گئی۔ سٹاف روم میں ایک حسین ٹیچر مسز مجید قاضی اپنی کسی کولیگ کا ہاتھ دیکھ رہی تھیں پتہ لگا کہ وہ خواب کی تعبیر بھی بتا سکتی ہیں۔ ڈرتے ڈرتے میں نے ان کو قائداعظم والا خواب سنایا۔ اچھل پڑیں۔ ''واہ!!۔ کیا مبارک خواب ہے!!۔ خوب شہرت پاؤ گی'' پھر خود ہی میرا ہاتھ پکڑ کر دیکھنا شروع کیا۔ کچھ توقف کے بعد بولیں'۔

''شہرت کے علاوہ لمبی عمر اور بہت ساری ایجوکیشن بھی قسمت کی لکیروں میں لکھی ہے۔'' ایسی ہی باتیں کچھ عرصہ بعد ایک پامسٹ اقبال حسین صاحب نے بھی بتائی تھیں''۔

جنرل سکندر مرزا کی حکومت تھی تب بانو سکول کی طالبہ تھی۔ ایک رات بانو نے خواب میں دس گیارہ ہوائی جہازوں کو بڑی مشکل میں اڑتے دیکھا کچھ دیر بعد ایک بڑا سا ہوائی جہاز ہچکولے کھاتا نظر آیا۔ پرواز کے دوران سارے ہی جہازوں کو بڑی دقت کا سامنا تھا۔ لوٹنیاں کھاتے کھاتے اڑ رہے تھے۔ سب کا جھکاؤ زمین کی طرف تھا۔ صبح اٹھ کر بانو نے یہ خواب بھی ماں باپ کو سنایا کہ اب وہ بانو کے اس قسم کے خوابوں میں بڑی دلچسپی لینے لگے تھے۔

دو تین دن بعد صبح کی نیوز بلیٹن میں جہاں آرا سعید (مرحومہ) نے ریڈیو پر، ہیڈ لائینز میں انگریزی

میں پہلی خبر دی کہ جنرل سکندر مرزا نے اپنی کابینہ توڑ دی۔ پیر صاحب (والد) نے فوراً کہا۔ ''چلو! اب سکندر مرزا بھی گئے کہ گئے'' اور وہی ہوا۔ ملک میں جنرل ایوب خان والا مارشل لا لگ گیا۔

باآنو نے طالب علمی کے دوران جو بھی امتحان دیا خواب میں نتیجہ دیکھ لیتیں۔ بعض اوقات کلاس میں پوزیشن کا بھی پتہ چل جاتا۔ اپنے کسی بچے بچی کے بیمار پڑنے سے پہلے ضرور کوئی خواب دیکھ لیتی تھیں۔ مگر باآنو کے مطابق وہ اپنے اس قسم کے خوابوں کی تعبیر خود سے نکالنے سے ہمیشہ قاصر رہیں۔ وہ تو کوئی واقعہ وقوع پذیر ہو جاتا تب پتہ چلتا کہ خواب میں اسی طرف اشارہ تھا۔

اگر باآنو سے کوئی حاجتمند استخارہ کروائے تو بڑے وثوق سے نتیجے سے آگاہ کر دیتی ہیں۔ استخارہ کی اجازت ان کو پشاور صدر کی ایک سیدانی سے اتفاقیہ طور پر ملی تھی۔

محترمہ باآنو کی والدہ روحانی علاج کرانے کی ایک مانی ہوئی بی بی تھیں۔ مجوری، تیراہ خیبر، جم قدم وغیرہ قبائلی علاقوں سے ان کے مرید، مریدنیاں روحانی فیض حاصل کرنے آیا کرتے تھے۔ میرمن باآنو کو اپنی والدہ سے ہر تکلیف کے روحانی علاج کی اجازت ملی ہوئی ہے مگر تا حال ان کا میلان اس طرف نہیں جھک سکا ہے۔ باآنو کی ایک سابقہ کولیگ مسز حسن آرا امتیاز نے باآنو کو ماں کی گدی سنبھالنے پر کئی بار اکسایا مگر باآنو مائل نہ ہوئیں۔ چھوٹی موٹی تکالیف کے لئے قرآنی آیات پڑھ کر پھونک دیں گی جس سے اکثر فائدہ ہو جاتا ہے۔ باآنو اسے ایک اتفاقی امر گردانتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ ''یہ بھی ہمارے خاندانی عوارض میں سے ایک عارضہ ہوگا اور بس!!''

میرمن باآنو کی ''مور جان'' رات سونے سے پہلے بچوں کو اسلامی کہانیاں یا شیخ سعدیؔ کی کوئی حکایت ضرور سناتیں۔ معراج تک حضورؐ کا سفر بھی بڑے دلنشیں انداز میں بیان کرتیں۔ انہوں نے ہی بتایا تھا کہ سفرِ معراج کے لئے جبرائیل امین جنت سے جو گھوڑا ساتھ لائے تھے اس کا نام ''دُلدُل'' تھا۔

باآنو نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ اس کے سر کے اوپر ایک ہلکی سی انجانی سی جھنکار کی آواز آرہی ہے۔ اس نے جلدی سے اوپر نگاہ کی۔ دیکھا کہ سجے سجائے ''دُلدُل'' پر شاہانہ لباس پہنے حضورؐ تشریف فرما ہیں۔ دُلدُل نے ہوا میں ڈُلکی چال چلتے ہوئے باآنو کے سر کے اوپر ہوا میں ایک دو چکر لگائے انہیں حضورؐ کا لباس اور روشنی دیتے سلیم شاہی جوتے ہی دکھائی دیئے۔ آپؐ کا چہرہ مبارک نظروں سے اوجھل رہا۔ بڑی کوشش کے باوجود بھی باآنو آپؐ کا دیدار نہ کر سکیں۔ دُلدُل سرشاری میں ہنہناتا ہوا یہ جا وہ جا اوپر آسمانوں میں غائب ہو گیا۔ بچپن میں دیکھا ہوا وہ نظارہ باآنو کو آج بھی من و عن یاد ہے۔

شعور کی سرحدوں کو انہوں نے ابھی پوری طرح چھوا بھی نہیں تھا کہ گھر میں بنے بڑے سے چبوترے پر بیسیوں کی تعداد میں چھوٹے بڑے بچے بچیوں کو بیٹھے قرآن پاک کا آموختہ یا تلاوت کرتے باآنو دیکھتی۔ سنتی اور حظ اٹھاتی۔ پونے چھ سال کی عمر میں جب ان کی ''آمین'' ہوئی تو شاگردوں کو قرآن مقدس پڑھانے میں ماں کی مدد کرنے لگیں۔ یہ شغل باآنو صاحبہ نے شادی کے بعد بھی جاری رکھا مگر ایک اختراع کے ساتھ۔ جونہی کسی بچے بچی نے قرآن پاک ختم کیا۔ اس کو باترجمہ قرآن مجید جائے نماز اور شاگرد کے لئے مکمل جوڑا خرید کر ساتھ شیرینی کر کے اسے خوشی خوشی گھر سے رخصت کرتیں۔

''میری زندگی کی معمولات کے بدلاؤ (Change) کے ساتھ وہ پاکیزہ مصروفیت بھی اب مجھ سے چھن چکی ہے۔''

تعلیم :

زیتون باآنو اس وقت (پشتو، اردو) ایم اے بی ٹی۔ بی ایڈ ہیں۔

محترمہ زیتون باآنو نے قرآن پاک اپنی والدہ سے پڑھا۔ سیکھنے سمجھنے کی رفتار اتنی تیز تھی کہ ایک سال سے کم عرصے میں نہ صرف قرآن مجید ختم کیا بلکہ کئی چھوٹی بڑی سورتیں بھی از بر ہوگئیں۔ ساتھ ہی گھر پر پشتو اردو اور کسی حد تک فارسی کی سوجھ بوجھ بھی ماں سے پائی۔ فارسی پڑھنے کی حد تک باآنو کو یہ فائدہ ضرور ہوا کہ انہوں نے جب ایف۔ ایس۔ سی میں فارسی بطور اختیاری مضمون چنی تو ہر کلاس ٹسٹ اور امتحان میں ان کے نمبر پوری کلاس سے زیادہ ہوتے تھے۔ والدہ نے فارسی کی بجائے عربی لینے پر بہت زور دیا مگر آخر میں جیت باآنو ہی کی ہوئی میر من باآنو اپنی ابتدائی تعلیم کا سارا کریڈٹ اپنی والدہ کو دیتی ہیں۔

محترمہ باآنو کو بھائی کی دیکھ بھال کی خاطر اسلامیہ کالجیٹ سکول پشاور میں داخل کرایا گیا تھا۔ اردو پشتو والدہ سے پڑھ چکی تھیں اس لئے ان کو ادنیٰ اور اول جماعت میں بیٹھنا نہیں پڑا بلکہ سیدھی جماعت دوم میں بیٹھیں۔

اسلامیہ کالجیٹ سکول پشاور، صوبہ سرحد کا وہ تعلیمی ادارہ ہے جس کو کئی مایہ ناز شخصیات کی درسگاہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ جیسے بابائے غزل امیر حمزہ شنواری سیاسی شخصیت حیات شیر پاؤ وغیرہ۔

باآنو اپنے گاؤں سپینہ وڑی سے سکول تک اور واپسی پر بستے تختیاں ایک ہاتھ میں اور بھائی کا ہاتھ دوسرے ہاتھ میں تھامے اپنا تعلیمی سفر طے کرتی رہیں۔ کالجیٹ سکول ان کے گاؤں سے ڈیڑھ دو میل

کے فاصلے پر ہے۔

جماعت دوم کے سالانہ امتحان میں زیتون بانو اپنی جماعت میں فرسٹ آئیں۔ سکول کے جو طلباء اپنی کلاسوں میں اوّل، دوم اور سوئم آئے تھے ان کو سکول کے پرنسپل جناب سید سلطان حسین شاہ نے سامنے والے بڑے چمن میں مختلف انعامات سے نوازا۔ انعام پانے والے سارے طلباء میں بانو ایک اکیلی لڑکی طالبہ تھی۔

بانو کے انعام لینے کی باری آئی تو سب نے بہت تالیاں بجائیں لیکن بانو کی زیرک نگاہ نے یہ بھانپ لیا کہ ان کی اپنی جماعت کے چند لڑکوں نے تالیاں بجانے میں حصہ نہیں لیا۔ جماعت سوئم میں بھی بانو پڑھائی میں سب سے آگے تھیں۔ اس سلسلے میں بانو نے بتایا۔

> ''جب استاد کے سوال پوچھنے پر کوئی لڑکا یا لڑکی جواب نہیں دے پاتے تھے تو میں فوراً اپنا ہاتھ اوپر کو اٹھا لیتی۔ استاد کو درست جواب ملتا تو مجھ کو اشارہ کرتے۔ اس کی ناک پکڑو!!۔ منہ پر زور کا ایک جھانپڑ رسید کرو!! میں ہچکچاتی تو ہاتھ میں چھڑی مجھے دکھا دیتے۔ جلدی کرو! ورنہ اس مولا بخش سے تیری ہی پٹائی کرتا ہوں۔ اسی طرح استاد کی دھونس سے ڈر کر ایک دفعہ ایک ہم جماعت لڑکے خوشحال نامی کی ناک کا بہت سارا گندہ ملبہ میرے ہاتھ میں آ لگا۔''

بانو اس دوسرے طالب علم یا طالبہ کے جواب نہ دینے پر خود جواب کے لئے ہاتھ اٹھا لینے پر پچھتائیں بھی لیکن بچپن آخر بچپن ہوتا ہے اور خودنمائی بچپن کی ایک ادا سمجھیں بانو صاحبہ اسلامیہ کالجیٹ سکول پشاور کے اپنے اساتذہ کے نام بڑے احترام سے لیتی ہیں۔ ان میں محترم بوستان استاد پرائمری سیکشن کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ کبھی کبھار مختلف کلاسوں میں جا کر بچوں کے بستے چیک کیا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ استاد محترم عظمت علی شاہ، محترم عزیز استاد، محترم نجیب خان استاد، جناب ماسٹر رازق، محترم حاجی ملوک استاد۔

''پتہ نہیں ان میں سے کوئی حیات بھی ہوں گے!! یا اللہ کو پیارے ہو چکے ہوں گے'' بانو صاحبہ نے بڑے دکھ سے کہا۔

سکول کے اس زمانے کے پرنسپل سید سلطان حسین شاہ ایک سخت گیر منتظم مگر بڑے مہربان شخص تھے۔ سارا سکول ان سے بہت ڈرتا تھا کیا طلباء اور کیا اساتذہ۔ مگر جب بھی پرنسپل صاحب نجیب خان استاد کی کلاس میں کسی کام سے گئے۔ نجیب خان استاد پرنسپل کے احترام میں سیٹ سے کبھی نہیں اٹھے۔ پتہ چلا کہ

استاد محترم مجیب خان پرنسپل کے استادرہ چکے تھے۔

جس زمانے میں بانو پورے انہماک سے پڑھائی میں جتی ہوئی تھیں۔خاندان کے کچھ بڑے بوڑھوں اورخواتین نے بانو کے والدین کو یاددہانی کرانی شروع کی کہ شرم کا مقام ہے بیٹی لڑکی ہوکرلڑکوں میں بیٹھی پرائے مردوں سے پڑھ رہی ہوتی ہے۔مگر جلد ہی بانو کے والد نے اپنی چہیتی بیٹی "بانوگئی" کی خاطر گاؤں چھوڑ کراسلامیہ کالج کے رہائشی علاقے میں سکونت کا بندوبست کرلیا۔اس طرح بانو دوبارہ سکول جانے لگی اسی سال کوئی سکول انسپکٹر صاحب آئے تھے۔سوالات پوچھتے پوچھتے جب بانو کے قریب پہنچے تو استاد نے انسپکٹر صاحب کے کان میں کچھ کہاوہ مسکرائے۔بانو پر کچھ زیادہ ہی سوالات کی بوچھاڑ کردی۔ ایک سوال اوراس کا جواب بانو کواب تک یاد ہے۔

''بتاؤ چیتھڑے کو پشتو میں کیا کہتے ہیں؟''

بانو نے رسا سے جواب دیا''چیرڑہ''

انسپکٹر صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔استاد صاحب سے کچھ بولے۔انہوں نے وہ لکھ لیا۔دونوں مسکرا کرآگے بڑھ گئے۔

اور''بانوگئی'' کا دل اس وقت بلیوں اچھلنے لگا تھا جب شام کو''داجی'' نے سینے سے لگا کر بہت سارا پیار دیا۔بانو پورے پرائمری سیکشن میں فرسٹ آئی تھیں۔لیکن بانو کو فرسٹ آنے کی اہمیت کا کوئی خاص ادراک نہیں تھا اسے تو اس بات کی خوشی تھی کہ''داجی'' نے اپنی بیٹی''بانوگئی'' کو بے تحاشا پیار کیا تھا۔

جماعت سوئم کا سالانہ امتحان منعقد ہونے سے قبل ہی اسلامیہ کالج کے روس کیمپل ہال میں اسلامیہ کالجیٹ اوراسلامیہ کالج کی مشترکہ تقسیم انعامات کی تقریب کا انعقاد ہورہا تھا۔جودھ پور کے راجہ مہمان خصوصی تھے۔زیتون بانو جیسی چھوٹے قد کاٹھ کی بچی کو جس وقت جودھ پور کے راجہ پرائمری سیکشن میں ٹاپ کرنے پرانعام دے رہے تھے تو راجہ صاحب کوآگے کافی جھکنا پڑا۔اس پر ہال میں موجود چندلوگ ہنس بھی پڑے تھے۔

بانو ابھی تک راجہ صاحب کا اس کے آگے جھکنا اورتالیوں کی وہ گونج نہیں بھولی ہیں جس وقت کہ وہ اپنا انعام لینے کے واسطے روس کیمپل ہال کی پچھلی سیٹوں سے اپنی باری پراٹھ کرآگے سٹیج کی طرف بڑھ رہی تھی اورتالیاں بج رہی تھیں۔

بانو نے اس لمحے بھی روس کیمپل ہال کی تالیوں کی وہی گونج سنی تھی جب ان کی کتاب خوبونہ''خواب'' پر ہجرہ ایوارڈ اورایوان صدر میں 98-1997ء کا ادب کا تمغہ حسن کارکردگی کا ایوارڈ صدر فاروق لغاری

ے وصول کر رہی تھیں۔

بانو صاحبہ نے بتایا کہ ''دونوں مواقع پر جب تالیاں بج رہی تھیں تو میں ماضی میں کافی دور تک بچپن کی
یوں میں نکل چکی تھی۔''

بانو نے یہ بات تو محسوس کر لی تھی کہ چند ہم جماعت لڑکوں کی آنکھوں میں اس کے لئے غصے اور نفرت کی
گاریاں سلگ رہی ہیں خاص کر ان طالبعلموں نے تو حد کر دی تھی جو استاد کے حکم پر بانو سے پٹتے رہتے
ے ان میں سے ''پاؤ کی'' گاؤں کا رہنے والا تاج محمد نامی لڑکا سب سے آگے تھا۔ مگر بانو برداشت کرتی
یں آخر کب تک؟ ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ چنانچہ ایک دن گالیوں اور غلیظ باتوں سے بھرا جو
حہ اس کی طرف پھینکا گیا وہ اٹھا کر سیدھی پرنسپل صاحب کو دفتر دے آئی۔ بانو کے اتنا عرصہ خاموش رہنے
ن شریر لڑکوں کو یہ بھی جرأت ہو گئی تھی کہ رقعہ میں باقاعدہ اپنے نام بھی لکھ دیئے تھے۔ پرنسپل صاحب نے
ں سب کو اپنے دفتر بلوایا۔ ساری کلاس کو سانپ سونگھ گیا۔ استاد صاحب بھی اٹھ کر چلے گئے۔ وہ سارے
کے ہاتھ اور کمر ملتے ہوئے کلاس میں روتے روتے واپس آئے ماسوائے تاج محمد کے کہ وہ بڑی عمر کا تھا
ید۔ اب وہ سارے شریر لڑکے نظریں نیچی کئے کلاس میں بیٹھے رہتے۔ تب سے استاد صاحب کلاس کی
ب بچیوں کو اپنی کرسی کے قریب بٹھانے لگے تھے۔ کلاس کی ان طالبات میں پرنسپل صاحب کی اپنی بیٹی
طان انور بھی شامل تھیں کہ اس وقت تک قرب و جوار میں لڑکیوں کا کوئی علیحدہ سکول نہیں تھا۔

تاج محمد آدھی چھٹی میں بستہ اٹھا کر ایسا غائب ہوا کہ دوبارہ سکول مڑ کو بھی نہیں دیکھا۔ بانو کو آج تک
ں کا دکھ ہے کہ ایک فرد کی پڑھائی شاید اس کی وجہ سے ادھوری رہ گئی۔ ''اللہ کرے تاج محمد اپنی ساری
شمنیں پس پشت ڈال کر کسی اچھی تعلیمی درسگارہ سے علم کی روشنی حاصل کر چکا ہو۔''

تیسری جماعت شاندار طریقے سے پاس کر کے بانو جماعت چہارم میں پہنچ گئیں وہ آگے پڑھنا چاہ
ں تھی۔ اکثر سوچا کرتی۔ سہیلیوں سے بھی ذکر کرتیں کہ ڈاکٹر بننے میں صرف چودہ پندرہ سال رہ گئے
ں۔ باپ بھی ان خوابوں میں شامل تھے مگر ماں خاندانی روایات کی جکڑ بندیوں میں قید تھیں۔ ماں جیت
ئیں۔ گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد زیتون بانو کی پڑھائی دھری رہ گئی اور گھر بٹھا دی گئیں۔

اس بارے میں جب محترمہ زیتون بانو سے استفسار کیا تو بتایا۔

''ماں بیچاری بھی کیا کرتیں!۔ خاندان کا دستور ہی یہ تھا کہ سات سال کا لڑکا بھی
زنان خانے میں قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ کنواری لڑکیوں کے برقعے نہیں ہوا کرتے
تھے۔ بصد مجبوری ڈولیوں میں ننھیال ددھیال جا سکتی تھیں۔ وہ بھی عموماً رات

کے اندھیرے میں گئیں اندھیرے میں واپس لوٹیں۔ جہاں اتنا سخت پردہ ہو کہ
ماموں زاد، چچازاد سے بھی پردہ کرایا جاتا ہو۔ جوان لڑکیاں دوپٹہ تک اندر
کمرے میں بدلتی تھیں وہاں لڑکیوں کا سکول کالج جانا کہاں ممکن تھا؟؟'' ۔1

یہ تمام حقائق اپنی جگہ درست مگر زیتون بانو نے اپنے دل ودماغ میں علم کی روشن شمع کی لَو کو بجھنے نہ دیا۔ گھر میں موجود کتابیں، اخبار اور رسالے پڑھتی رہتیں اور سوچا کرتیں کہ ماں کو مزید پڑھنے کیلئے کیسے راضی کیا جائے۔ یہ غم کھاتے کھاتے بانو کو ریومیٹک فیور نے آن دبوچا کھانا پینا تقریباً بند ہوا۔ علاج جاری تھا۔

اسلامیہ کالجیٹ سکول پشاور میں پڑھنے والی طالبات صرف ساتویں جماعت تک ''کوایجوکیشن'' سے فائدہ اٹھا سکتی تھیں۔ کالج کے ملازمین کے لئے انتظامیہ نے ایک بس کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ اب اسی بس سے بچیاں پشاور صدر اور شہر کے سکولوں میں پڑھنے جاتیں آتیں۔ بانو لڑکیوں کو حسرت کی نگاہ سے دیکھتیں۔ موقع ملنے پر اپنے ہمدردوں کو اپنا دکھڑا سناتیں اور آخر کار تقریباً دو سال بعد بانو کے معالج، ڈاکٹر شعیب کی زبردست سفارش پر بانو کو ازبتھ گرلز ہائی سکول پشاور میں داخل ہونے کی اجازت مل گئی۔ یہ ایک مشنری سکول تھا جس کی پرنسپل ہمیشہ آئیر لینڈ کی کوئی نہ کوئی نن (Nun) ہوا کرتی تھیں۔ جو کیتھولک مسلک سے تعلق رکھتی۔

یہاں بہترین تعلیمی کارکردگی دکھانے پر زیتون بانو کو سات روپے ماہانہ وظیفہ ملنے لگا تھا۔ بانو نے اس موقع پر بتایا۔

''میں نے ہر امتحان میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ دن رات ایک کیا مگر اپنی دوست اور گہری سہیلی شیریں تاج جو بی۔سی۔ جی ٹیم کی گاڑی کے ڈرائیور کی بیٹی تھی کو نیچا نہیں دکھا سکی وہ دو چار نمبر مجھ سے ضرور زیادہ حاصل کر کے کلاس میں فرسٹ آتیں اور میں سیکنڈ پوزیشن پر رہتی۔

ایک سال میں نے چوتھی پوزیشن بھی لی تھی کہ عین امتحان کے دنوں میں مجھے ریومیٹک فیور کا ایک اور زبردست اٹیک ہو گیا تھا۔ ماں باپ کو میری جان کے لالے پڑ گئے تھے۔

ویسے کلاس کے اکثر ٹیسٹوں میں شیریں تاج سے زیادہ نمبر لیتی تھی۔ سالانہ امتحانات میں کلاس میں فرسٹ نہ آنے کی وجہ غالباً میری بدخطی تھی۔ دراصل ابتداء میں

فطری طور پر بائیں ہاتھ سے لکھنا شروع کیا تھا۔ مگر ماں نے زبردستی دائیں ہاتھ سے
لکھنے پر مجبور کیا۔ شاید یہ اسی کا شاخسانہ ہے کہ اب بھی اپنے لکھے اکثر الفاظ پڑھنے میں
مجھے دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ میرا قلم میری سوچ اور خیالات کا
ساتھ دینے سے اکثر لاچار رہتا ہے۔
شیریں تاج کی لکھائی بہت صاف ستھری تھی۔ محترمہ زوالوجی ڈیپارٹمنٹ کی
چیئرپرسن بھی رہ چکی ہیں اب ریٹائرڈ ہیں اور کبھی کبھار ملتی بھی ہیں۔''

زیتون بانو نے 1955ء میں اسی مشن سکول سے سائنس کے مضامین کے ساتھ میٹرک پاس کیا۔ اس زمانے میں بانو کے والد پیر صاحب پرائیویٹ بی۔ ایس۔ سی آنرز کر کے ریڈیو پاکستان میں انجینئر کے عہدے پر فائز ہو چکے تھے۔ اس سے قبل آپ اسلامیہ کالج پشاور کی فزکس لیبارٹری میں ڈیمانسٹریٹر کی حیثیت سے ملازم تھے۔ چونکہ انجینئرز کو صبح سویرے ڈیوٹی پر پہنچنا ہوتا تھا۔ ریڈیو سٹیشن دور پڑتا تھا لہٰذا! مجبوراً شہر میں ڈھکی نعلبندی، جو ادارۂ اشاعت سرحد اور افغان بلڈنگ قصہ خوانی کے پیچھے واقع تھی کرائے کا ایک چھوٹا سا مکان لے لیا۔ بانو کے لئے بھی اپنے کالج، فرنٹیئر کالج فار ویمن آنا جانا سہل ہو گیا تھا۔ بانو اپنے کالج کے میگزین میں لکھتی رہیں۔ ''طلوع'' کے پشتو حصے کی ادارت فضل حق شیدا جو پشتو زبان کے نامور شاعر ادیب، نقاد اور کسی حد تک محقق بھی تھے، کی صاحبزادی نسیمہ شیدا تھیں۔ نسیمہ شیدا آرٹس کی سٹوڈنٹ تھی اور زیتون بانو سائنس کی طالبہ تھی مگر قلم سے ادبیانہ رشتہ بھی استوار تھا۔ بانو سے اگر کوئی تحریر مانگی جاتی تب وہ چھپوانے دیتیں۔

1957ء میں زیتون بانو جب ایف۔ ایس۔ سی کے فائنل میں پہنچیں تو اپنی زندگی کے سب سے بڑے حادثے سے دوچار ہوئیں۔ بار بار کے بخار نے اپنا رنگ دکھایا۔ ڈیٹنیشن کے امتحان کے دوران 106.4 ڈگری بخار کے ساتھ لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں داخل ہو کر میڈیکل وارڈ بی کے بیڈ نمبر 7 پر 9 ہفتے گزارے۔ اور ایک بار پھر ڈاکٹر پروفیسر رضا اور لیڈی ڈاکٹر فرخ زبیری نے پیر صاحب کو مشورہ دیا کہ بانو کو ایگزرشن سے بچانے کے لئے کھیل کود اور پڑھائی بند کرائیں۔ ٹیوبر کلوسسز پیرا کارڈائیٹس ود ایفیوژن کی مریضہ ہے کہیں دل کے اوپر کی جھلی پھٹ گئی تو موت یقینی ہے۔ تفصیل پوچھنے پر محترمہ نے بتایا۔

''میرے دل کے اوپر کی جھلی میں پانی پڑ گیا تھا جس میں ٹی۔ بی کے جراثیم
تھے۔ علاج اور پرہیز طویل تھے۔ آج تک انجائنا کی پیشنٹ ہوں۔ ادویات

زندگی بھر کا روگ بن چکی ہیں۔ دوائیوں سے اکثر تنگ بھی آ جاتی ہوں۔ مگر ادویہ
متواتر اور باقاعدگی سے اس لئے لے رہی ہوں کہ یہ میرے بچوں کی ایک معصوم سی
خواہش ہے کہ اپنا خیال رکھوں۔ رہا پرہیز۔ تو وہ میری مرضی پر منحصر ہے۔ گاہے
پرہیز کا لحاظ رکھتی ہوں۔ گاہے بدپرہیزی بھی کر لیتی ہوں۔"

کالج میں زیتون بانو کو 15 روپے ماہانہ وظیفہ ملنے لگا تھا۔ کالج کے سائنس گروپ کی فیس 13 روپے 4 آنے تھی۔ ماہانہ فیس لیٹ ہونے کی صورت میں ایک آنہ روز کا جرمانہ لگتا تھا۔

ایک بار بانو کی فیس چٹ پر بھی جرمانہ درج دیکھ کر والد نے دریافت کیا" کیا کالج سے غیر حاضر رہی تھی؟" بانو نے بتایا کہ پچھلے ماہ فیس ادا نہیں کی تھی۔ ایک آنہ روز کے حساب سے یہ جرمانہ کی رقم ہے۔ "داجی" غصہ ہوئے۔ "فیس کیوں وقت پر ادا نہیں کی تھی؟؟ ۔۔۔ بانو کا جواب تھا۔" آپ لوگوں نے دی نہیں تھی۔"" داجی" کا پارہ مزید چڑھا۔" تو تم مانگ لیتی نا!! ۔۔۔ بانو نے آہستہ سے کہا۔۔۔

"آپ لوگوں کو تو پتہ ہے کہ فیس ہر ماہ دینی ہوتی ہے۔ میں کیوں خود
مانگتی؟" اس پر پیر صاحب آپے سے باہر ہو گئے۔۔۔" نواب کی بچی کہیں
کی!!۔ ماں باپ سے پیسے مانگتے ہوئے شرم آ رہی تھی"؟؟ ۔۔۔ اور اس کے
ساتھ ہی جیب سے 30 روپے نکال کر بانو کے منہ پر دے مارے۔

بانو نے اس پر بتایا۔۔۔" واقعی شرم کے مارے اپنے شوہر تاج سعید سے بھی
کبھی پیسوں کا مطالبہ نہیں کیا۔ اب دونوں بیٹے نصیر آذر اور ظہیر بابر ماشاءاللہ برسر
روزگار ہیں مگر ضرورت پڑنے پر بھی پیسے مانگتے ہوئے شرم محسوس کرتی ہوں۔"

ابھی بانو ہسپتال میں زیر علاج تھی کہ فرنٹیئر کالج فار ویمن کی پرنسپل مس ہار باٹل کی طرف سے بانو کے وظیفے کی وصولی کے لئے خط آیا۔ مگر پیر صاحب نے شکریے کے ساتھ لکھا کہ میری بچی بیماری کے سبب شاید آگے نہ پڑھ سکے۔ لہٰذا وہ اس وظیفے کی حقدار نہیں بنتیں آپ بانو کا یہ وظیفہ کسی اور مستحق کو دیں۔

سال ڈیڑھ بعد بانو نے دوبارہ داخلہ لے کر ایف۔ ایس۔ سی کر ہی لیا لمبے لمبے پریکٹیکل ہوا کرتے تھے۔ سو بانو پھر بیمار پڑ گئیں۔ ڈاکٹر نے پھر آرام کا مشورہ دے دیا۔ کالج یونیورسٹی میں باقاعدہ پڑھنے کی حسرت بانو کے دل میں گھٹ کر رہ گئی۔

زیتون بانو کا ارادہ پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کا تھا۔ اس سلسلے میں پروفیسر پریشان خٹک کی زیر نگرانی کچھ عرصہ کام بھی کیا مگر ایک روز جوہر میر (مرحوم) جو اردو ہندکو کے شاعر، ادیب اور صحافی تھے ان کو

ملے۔تاج نے بتایا کہ بانو پی۔ایچ۔ڈی کر رہی ہے۔چھوٹتے ہی بولے۔"بانو جی!! چھوڑو اس کو۔تخلیقی کام کرو۔پشتو ادب کو تمہاری بہت ضرورت ہے۔پی۔ایچ۔ڈی کر کے تم زیتون بانو سے اور کیا بن جاؤ گی؟؟" اور بانو نے پی ایچ ڈی کرنے کا ارادہ چھوڑ دیا۔

2005ء میں محترمہ بانو نے اپنی اور تاج سعید صاحب کی مشترکہ لائبریری پشتو اکیڈمی یونیورسٹی آف پشاور کو تحفتاً حوالے کی۔اس گراں بہا عطیہ میں اردو، پشتو، انگریزی، فارسی، ہندکو، پنجابی وغیرہ کی ڈھائی ہزار سے زیادہ کتب، رسائل اور کچھ مسوّدات بھی شامل تھے۔متاع لائبریری میں کافی نایاب نسخے بھی تھے۔تاج سعید اپنی ساری بچت کتابیں، رسائل خریدنے اور چھپوانے پر خرچ کر لیا کرتے تھے۔ایک بار مرزا غالب کے انڈیا میں چھپے ہوئے ایک خاص نمبر خریدنے کے لئے اپنے سسر سے رقم مانگنی پڑی تھی کہ مہینے کی آخری تاریخیں تھیں اور میاں بیوی دونوں کی جیبیں خالی تھیں۔یہ نایاب نمبر بھی پشتو اکیڈمی کی ملکیت بن چکا ہے جو مرزا اسداللہ خان غالب کے غیر مطبوعہ کلام پر مشتمل ہے۔

محترمہ زیتون بانو کو اب ذاتی طور پر اپنی ڈگریوں، سرٹیفکیٹوں اور توصیفی و تعریفی اسناد سے نفرت سی ہو چلی تھی۔جس فائل میں یہ سب کچھ محفوظ پڑا تھا وہ ان کی آنکھوں سے کچھ عرصہ اوجھل رہی تھی۔مگر پشتو اکیڈمی کو اپنے گھر کی ذاتی لائبریری جب حوالے کر رہی تھیں تو وہ فائل بھی نکل آئی۔بانو نے سب ڈگریاں، سارے سرٹیفکیٹ، تمام اسناد پرزے پرزے کر ڈالے۔اس پر تسلی نہ ہوئی تو سب پرزے اکٹھے کر کے ان کو تیلی دکھا کر راکھ کا ڈھیر بنا کر پانی میں بہایا اور اطمینان کا سانس لیا۔کچھ عرصہ بعد ایک بکس میں سے اردو ایم۔اے کی ڈگری ہاتھ لگی وہ اسی بکس میں دوبارہ رکھ لی۔کیا یہ پچھتاوا تھا کہ سب کچھ کیوں بھسم کر ڈالا؟۔یا اس بچ جانے والی ڈگری سے لاتعلقی کا اظہار تھا؟

اپنی ایک نظم "سندونہ" (اسناد) میں بانو صاحبہ نے اپنے احساسات کچھ یوں بیان کئے ہیں۔۔۔۔۔
زیتون بانو کی پشتو نظم

"سندونه "(اسناد)

قاتلې!!!............
تاخان نن قتل کړو، خپل خان دې پخپله مړ کړو
خپل خان دې اوورژلو، مړدې کړو تمونې دِ کړلو
ذرې ذرې ، قطرې قطرې دې کړو فنادې کړلو

هرې ذرې، هرې قطرې درته منت کولو
سوال کتولو
دا سې خومه کوه داته څه کوې؟
خپل ځان دې مړ کړو ، ځان دې قتل کړلو
څه!!لاړی لاړی
دمودوخوارې دې تولې لاړې
هسې عبثې لاړې!!
ینو ینو سند، سرتیفیکیټ دې په او بولا هو کړو
هر ینو ایوارډ دې ترپنبو ریز مریز کړو
تولو دګروته دې هو رورته کړلو!!
ته والئی چی، دا اوس خماڅه پکار دی؟
ماترنی نه څه حاصل کړه؟
ته وائی چی،هسې مې ژوند تېر کړو، خواروزارمې لېر کړو
دونی ماله تول ،عمر کنبی هیڅ را نکړل !!
داسندونه، داډګری به راله اوس څه را کړې؟
خکه مې تول هورته ورواچول، په اوبولاهو کړل
حتماپه کار را نغلل ماله بې کا ره وو تول
نوپه رشتیا چې ستاډ ګرئی ستاسندونه اوس ستانه دی پکار
څکه دې داسې ینوپه ینو ضائع کړل
خوچې ته مړه شې نوشاید چې بیاپکار دې راشی
ستاد څېړنې نېتېه دې کنبی لیک وی
خلق به ئې ولتهوی اوبه ئې مومی
په یوه کتبه به ئې ولیکی
بیا اوستاد ځلی په خازه به هفه لیک پاتی شی
شاید چې داسې ته ژوندی پاتې شې

("منجیله" صفحه 25)

ترجمہ:۔

اسناد(سندونه)

قاتلہ!!!

تو نے آج خود کو قتل کر ڈالا؟

اپنا آپ ٹکڑے ٹکڑے، ذرہ ذرہ، قطرہ قطرہ کر کے فنا کر ڈالا۔

ہر قطرہ، ہر ذرہ منت سماجت کر رہا تھا، چیخ رہا تھا کہ یہ کیا کر رہی ہو؟

ایسا تو مت کرو!!

تو نے خود کو مار ڈالا!! قتل کر دیا!!

سالہا سال کی محنت عبث گئی۔ رائیگاں گئی۔

ایک ایک سند، ایک ایک سرٹیفیکیٹ پانی میں بہا دیئے۔

ہر ایوارڈ پاؤں تلے روند ڈالا!!

ساری ڈگریاں ریزہ ریزہ کر کے جلا ڈالیں

تیرا کہنا ہے کہ ''یہ اب میرے کس کام کی؟؟''

مجھے ان سے کیا ملا؟

میں نے ان کے حصول کے لئے زندگی کے کتنے ہی دن، کتنی ہی راتیں بخش دی تھیں!!

بدلے میں کیا حاصل کیا؟؟

یہ اسناد، یہ ڈگریاں مجھے اب کیا دیں گی؟؟

تب ہی ان سب کو جلا ڈالا۔ جلا کر انکی راکھ پانی میں بہادی۔

تو واقعی یہ سچ ہے کہ تیری ڈگریاں، تیرے تعریفی اور توصیفی اسناد اسی لئے سب کو ایک ایک کر کے ضائع کر دیا؟؟

مگر سنو!!

شاید۔۔۔۔پس مرگ یہ تیرے کام آ جاتیں۔

کہ تیرا جنم دن، تیری پیدائش کی تاریخ ان میں درج ہے۔ شاید

لوگ وہ ڈھونڈھ نکالتے۔ ایک پتھر پر کھدوا دیتے

اور وہ پتھر وہ کتبہ، جس پر تیرا نام بھی لکھا ہوتا

تیری قبر کی زینت بن جاتا اور شاید۔۔۔
اس طرح تو زندہ رہ لیتیں!!!

محترمہ زیتون بانو 1986ء میں اپنی بیٹی کے ایک کڑوے سچ کا جوذائقہ چکھ چکی تھیں۔ مدتوں اس کی کڑواہٹ محسوس کرتی رہیں۔ اس کی چبھن، اسکا غبار، اس کا زہر وہ اپنی اس نظم ''سندونہ'' (اسناد) میں جس سچائی، جس درد اور جس پیرائے میں بیان کرتی ہیں وہ انہی کا حصہ ہے۔

1960ء میں بانو نے پشتو آنرز کیا۔ صرف انگلش بی اے کا امتحان دے ڈالا اور بی اے کی ڈگری مل گئی۔ وہ چونکہ بی۔ایڈ کرنا چاہ رہی تھیں۔ اس لئے فل ٹیکنکس میں دوبارہ بی اے کا امتحان دینا پڑ گیا۔ اس درمیان پتہ لگا کہ صرف سی ٹی کر لی جائے تو بھی بی۔ایڈ کیا جا سکتا ہے۔ میرمن بانو نے لگے ہاتھوں سی ٹی بھی پاس کر لی۔ پہلے بچے نصیر آذر کی پیدائش تک محترمہ زیتون بانو بی اے۔سی ٹی ہو گئی تھیں۔

یہ 1964ء کی بات ہے کہ بی۔ایڈ کی تیاری زور شور سے شروع ہوئی لیکن تاج سعید نے مزید کوئی امتحان دینے سے روکا کہ گھر اور بچے پر توجہ دو چنانچہ بانو صاحبہ کچھ عرصہ خاموش تو رہیں مگر اس دوران شاعری اور افسانے پورے انہماک سے لکھتی رہیں۔ ساتھ ہی پشتو ایم اے بھی مکمل ہوا اب وہ ماشاءاللہ چار بچوں کی ماں تھیں۔ گھر کی ضروریات کا تقاضا تھا کہ ملازمت بھی کی جاتی رہے۔ بی۔ایڈ کی اہمیت نے دوبارہ سر اٹھایا۔

چوتھا بچہ بابر سعید تقریباً تین برس کا تھا کہ ماں نے امتحان کے لئے کمر ہمت باندھ لی۔ اس سلسلے میں محترمہ بانو نے ہنستے ہوئے ایک چھوٹا سا واقعہ سنایا۔ جس سے آپ بھی بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ گھر گھرداری سنبھالتی، بچوں کی پرورش اور ملازمت کرتی زیتون بانو نے کن کٹھن اور نامساعد حالات میں سب کچھ سنبھالا ہوگا اور ساتھ لکھنے لکھانے کے فرائض بھی کیسے نبھائے ہوں گے۔

بانو نے بتایا۔

''عین میرے بی۔ایڈ کے امتحان کے دوران بابر، جسے ہم بوبی کہہ کر بلاتے ہیں تیز بخار میں مبتلا، مارے بخار کے پھنکتا رہا۔ اس کی تیمارداری میں پورا دن گزارا شام کو بوبی کی طبیعت ذرا سنبھلی۔ دوسرے دن میرا انگلش کا پیپر تھا۔ رات کا کھانا تیار کر کے تاج اور بچوں کو کھلا کر پیپر کی تیاری کرنے بیٹھی۔ مگر ٹی وی کی آواز حارج ہوتی رہی۔ آواز ذرا ہلکی کی۔ بوبی نے اس پر احتجاجاً چیخنا شروع کیا میں مزید ڈسٹرب ہوئی۔ غصے سے جا کر ٹی وی ہی بند کر دیا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ کمرے کا دروازہ

زور سے کھلا۔ بوبی اندر داخل ہوا۔ خاموشی سے مجھے گھورتا رہا۔ پھر منہ بسور کر بولا۔ ''ھن!!۔۔ شرم بھی نہیں آتی۔ بوڑھی عورت ہو کر امتحان دے رہی ہے۔۔۔۔ عینک ناک پر رکھی ہے۔ کتنی تو بری لگ رہی ہے۔۔۔'' اور دھڑام سے دروازہ بند کر کے بھاگ گیا۔

1987ء میں زیتون بانو نے انگلش ایم۔اے کرنے کا ارادہ کیا۔ رول نمبر آیا۔ مگر شوہر نے امتحان دینے سے منع کیا۔ بانو کو اب تک یاد ہے کہ تاج سعید صاحب نے ایسے موقع پر کہا تھا۔

''بانو!! اللہ کا واسطہ امتحانوں کا یہ جھنجھٹ اب چھوڑ دو۔ یہ بات فائنل ہے کہ اس گھر میں یا ایم۔اے کی ڈگریاں آئیں گی۔ یا یہاں تاج سعید رہیگا۔'' اور بانو کو ارادہ ترک کرنا پڑا۔ رول نمبر والا آیا لفافہ بند کا بند ضروری کاغذات کے بکس میں ڈالدیا۔ بانو کا کہنا ہے۔۔۔۔ مجھے یوں لگا جیسے اپنی کسی خواہش کا تابوت سنبھال لیا ہو۔۔۔۔''

تاج سعید صاحب بانو کے اکثر افسانوں کے ناموں سے متفق نہیں ہوتے تھے۔ اپنی طرف سے کسی افسانے کا کبھی ایک نام تجویز کرتے کبھی کوئی دوسرا نام۔ مگر بانو صاحبہ ٹال جاتیں۔

''دیکھیں تاج!! جس طرح آپ نے اپنے چاروں بچوں کے نام خود اپنی مرضی اور پسند کے رکھے ہوئے ہیں۔ اسی طرح مجھے بھی حق حاصل ہے کہ جو نام پسند آئے وہ اپنے افسانے کو دوں۔۔۔۔''

اس پر تاج صاحب باز نہ آئے ان کے مشورے جاری رہے تو بانو نے ایک اور راہ اختیار کی اور 1990ء میں اردو ایم۔اے کر ہی ڈالا۔ یعنی ایک طرح سے خاموش زبان سے اپنے شوہر سے کہا۔

''لو!!۔۔۔اب بولو!!۔۔۔۔۔''

محترمہ زیتون بانو اپنے شوہر تاج سعید کے نام کے ساتھ ''مرحوم'' لفظ ملانا قطعی برداشت نہیں کر سکتیں۔ وہ کہتی ہیں۔ ''تاج سعید زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے''

حالانکہ وہ 23 اپریل 2002ء کو رحلت فرما چکے ہیں۔

زیتون بانو نے یونیورسٹی آف پشاور سے ایم۔اے (پشتو، اردو) کی ڈگریاں لی ہیں۔ انہوں نے بی۔ایڈ بھی اسی یونیورسٹی سے کیا ہے۔ اور سی۔ٹی کا سرٹیفکیٹ محکمہ تعلیم سے حاصل کیا گویا معلمی کے لئے مکمل اسلحہ سے پوری طرح لیس ہیں۔

فرنٹیئر کالج فار ویمن پشاور جو اس زمانے میں سرحد کا ایک اکلوتا کالج تھا یہاں صوبہ بھر سے لڑکیاں تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو کر مختلف شعبہ زندگی میں اپنے اپنے حصے کی ذمہ داریاں نبھا رہی ہیں۔ کالج کا اپنا ایک ہاسٹل بھی ہے جس میں دور دراز علاقوں کی طالبات سکونت اختیار کی ہوئی ہیں سب کو گھر جیسا ماحول میسر ہے۔ اسی

کالج کے سٹیج پر زیتون بانو نے اپنا لکھا ہوا پشتو سٹیج ڈرامہ "انسان ارزان شو"۔ (انسان سستا ہوا) فضل حق شیدا کی بیٹی نسیمہ شیدا کی مدد سے پیش کیا تھا۔ ڈرامے میں بانو شوہر اور نسیمہ شیدا نے بیوی کا رول ادا کیا تھا۔ ڈرامہ بہت پسند کیا گیا۔ مصنفہ یعنی زیتون بانو کو کالج کی طرف سے ایک کپ اور توصیفی سرٹیفکیٹ عطا ہوئے۔

1958ء کے اواخر میں اسلامیہ کالج پشاور کے خیبر یونین ہال کے سٹیج پر آل پاکستان کالجز کا پشتو تقریری مقابلہ منعقد ہوا۔ عنوان تھا۔ "وینه چې خومره ژړیږي.. مینه دومره نه ژاړي " (لہو جن آنسوؤں سے روتا ہے پیار ویسا نہیں رو سکتا) یا Blood is thicker than water اس ڈیبیٹ میں کالج کی طرف سے زیتون بانو اور مہر تاج نے حصہ لیا۔ جو مہر تاج روغانی کے نام سے جانی جاتی ہیں۔ 2002ء میں صوبہ سرحد کی نگراں وزیر صحت بھی رہیں۔ حوصلہ افزائی کا انعام ملا جبکہ زیتون بانو تمام کالجز کے طلباء مقررین میں سیکنڈ بیسٹ پرائز 2nd Best Prize کی حقدار قرار پائیں۔ مولانا عبد القادر مرحوم سے جب اپنا بڑا سا کپ وصول کرنے کالے برقعے میں سر سے پاؤں تک ڈھکی منہ نقاب سے چھپائے زیتون بانو سٹیج پر گئیں تو کپ حوالہ کرتے ہوئے مولانا عبدلا قادر کہہ اٹھے "شاباش!!

چې دې میدان کښې هم درنه څوک وړاندې نهٔ شي..

ترجمه:

(شاباش!! اس میدان میں بھی کسی کو آگے مت بڑھنے دینا)

زیتون بانو نے کالا برقعہ اوڑھے منہ پر نقاب گرائے خیبر یونین ہال کے سٹیج پر کھڑے ہو کر اس تقریری مقابلے میں حصہ لیا تھا۔

شادی:

ہمارے مشرقی معاشرے کے مطابق زیتون بانو کے کئی رشتے آچکے تھے۔ لڑکی نے جوانی کی دہلیز پر ابھی قدم رکھا نہیں ہوتا کہ لوگ سرگرم ہو جاتے ہیں۔ لہذا بانو کے گھر کا دروازہ بھی لوگوں کی نظر میں آچکا تھا۔ مگر حسب نسب کا سوال اپنی جگہ پر موجود تھا۔ چنانچہ رشتوں کا جواب انکار تھا۔ قلندر مومند کا رشتہ مذہبی عقائید کی بنیاد پر اس وقت رد کیا گیا تھا جب بانو آٹھویں جماعت کی طالبہ تھی۔

62-1961ء کی بات ہے اوپر تلے چار رشتے آئے تھے۔ ایک پیر اقبال شاہ جو صرف مڈل تک پڑھا تھا۔ گھی کا کاروبار تھا۔ دوسرا نوشہرہ کے کسی ڈاکٹر کا رشتہ جو جناب قاضی حسین احمد کی ہمشیرہ مرحومہ زیب زینت کے توسط سے آیا تھا۔ مرحومہ زینت بانو کی سہیلی تھی۔ کافورڈیری کے خان غفور خان نے بھی اپنے بھتیجے

کا پیغام بھجوایا تھا اور جانے مانے شاعر، ادیب، نقاد اور صحافی تاج سعید بھی ان امیدواروں میں شامل تھے۔
بانو کے والدین مخمصے میں گھر گئے۔ ماں کا فورڈیری ء کے خان کے پیغام کے لئے راضی تھیں۔ بیٹی کی عمر بھی پیش نظر تھی۔ مگر پیر صاحب نے بیٹی کی مرضی کو مقدم جانتے ہوئے بانو کی سہیلی رضیہ خانم کو جو عمر میں بانو سے بڑی ہے بلوا بھیجا کہ وہ بانو کی مرضی معلوم کرے۔ چنانچہ رضیہ نے بانو کی دوسری سہیلیوں ثریا عظمت، سعیدہ زبیری، سلیمہ اور باجی جمیلہ کو صلاح مشورے کے لئے اکٹھا کیا۔ چاروں امیدواروں کے محاسن و معائب لکھے گئے۔ قرعہ فال تاج سعید پر نکلا۔ یہ سب کا مشترکہ فیصلہ تھا کہ۔۔۔خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ بانو کی والدہ کا اعتراض تھا کہ تاج سعید اہل رسول نہیں ہے۔ رضیہ نے قائل کرنے کی کوشش کی۔ ''چچی جان!! وہ خان بھی تو محض خان ہے سید تو نہیں ہے۔''
اور بانو نے پکا ارادہ کر لیا کہ اگر ماں نے اس خانزادے سے شادی کے لئے مجبور کرنے کی کوشش کی تو وہ ''مصلے'' پر بیٹھ جائے گی اور اپنے مشہور افسانے ''نتھ'' کے مرکزی کردار ''مارو'' کو دوبارہ زندگی دے گی اور خاندان میں ایک اور کنواری بڑھیا کا اضافہ ہو جائے گا۔ ماں ''مصلے'' والی بات سے کافی خوش اور مطمئن ہوئی تھی۔
''مصلے پر بیٹھنے'' کا مقصد مرتے دم تک کنواری رہنا ہے۔ آج بھی بانو کے خاندان کے اکثر گھروں میں ایک دو یا تین تین بہنیں بیٹیاں بن بیاہے بیٹھیں بوڑھی ہو رہی ہیں کہ ان کو کسی اہل رسول کا ہاتھ نصیب نہیں ہوا۔
پیر صاحب نہایت روشن خیال شخصیت کے مالک تھے ان کو یہ قبیح رسم ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ انہوں نے ایک پختون مرد اور پختون شوہر بن کر سارا معاملہ کلی طور پر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ماں نے سزا کے طور پر بیٹی کو بہت کم جہیز دیا۔
اور 1963ء میں اردو کے ممتاز شاعر، ادیب، مؤلف، نقاد، صحافی اور مدیر تاج سعید کے ساتھ زیتون بانو کی شادی ہو گئی۔ بانو کی رخصتی شوکت اللہ خان اکبر کی گاڑی میں ہوئی تھی۔ موصوف تاج سعید کے ڈگری والے مکان کے سامنے رہتے تھے۔ دونوں خاندانوں کے آپس میں قریبی تعلقات تھے۔ باراتیوں میں پشتو کے مایہ ناز شاعر اشرف مفتون بھی شامل تھے۔
کافی برس پہلے ناک میں نتھ پہننا دوشیزگی کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ دیہات میں لڑکی کی ناک چھدوانا عام بات تھی۔
''ننگی'' افسانے میں ''مارو'' ایک اہم کردار ہے۔ زیورات کی اتنی شوقین ہے کہ ناک میں ہر وقت نتھ

پہنے رہتی ۔عمر پچاس سے تجاوز کر چکی ہے ۔ایک روز بڑی بہن کی نظر اچانک مآرو کی خالی ناک پر پڑتی ہے۔وہ پوچھتی ہے۔

پشتو اقتباس:مارو !ذادې ولې اوويسته ؟؟

''بی بی!! خان راته بد سنبکاریدو ''اونن چې دهغې عمر تر پنځو سو ورړسیدلے وواثو دهغی دمشرې خورځه دپاسه پنځو سو کالوته ..نو .... هغې ته اوس خان بدی سنبکار ہدوچی لکه ديوی تنکی پیغلی دې نتکنی په پوزه لکه کرخوی.. نوځکه هغې لتکنی دپوزې نه اوويسته اود کلونو کلونو پروت زوړ کمخواب خوا کښې دکالوپه ډبلی کښې یئی دنوروپرتو کالوسره کېښوده

(مات بنگڑی۔۔صفحہ 35,21)

ترجمہ:۔

مارو!! یہ تم نے کیوں نکال لی؟''

''بی بی!!۔۔۔اپنا آپ برا لگ رہا تھا۔۔''اور آج جب اس کی عمر پچاس سال کو پہنچ چکی تھی اور بڑی بہن پچاس سے اوپر کی ہوگئی تھی تو۔۔۔۔اس کو اپنا آپ برا لگنے لگا تھا اس نے وہ نتھ ناک سے نکال لی کہ نتھ نوخیز بچیوں کی طرح ناک پر لہراتی پھرے۔اسی خاطر اس نے وہ نتھ ناک سے نکال لی۔اور برسوں پڑے بوسیدہ کمخواب کے ساتھ رکھے زیورات کے ڈبے میں پڑے ہوئے دوسرے زیورات کے ساتھ ڈال دی۔

میر من زیتون بآنو کے افسانے ''نتکئی'' کے اس چھوٹے سے اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجبور و لاچار جوانیاں سسک سسک کر ماہ وسال کی کالی آندھیوں کی راکھ تلے دب جاتی ہیں تو اکثر و بیشتر دبائی گئی آرزوئیں اور کچلے ہوئے جذبات مردہ راکھ میں سے چنگاری بن کر بھڑک بھی اٹھتے ہیں۔کڑوے سچ کا ایک زہریلا دھواں سارے ماحول میں پھیل کر معاشرے کی بند آنکھوں میں گھس کر حرکت میں لاتا ہے مگر وقت گزر چکا ہوتا ہے اور ہم بے بسوں کی مانند وہی کہانیاں پھر سے دہرانے لگتے ہیں۔

شادی سے پہلے زیتون بآنو کی دو کتابیں ''ھندارہ''(آئینہ)اور''مات بنگڑی''(کانچ کے

ٹکڑے) شائع ہو چکی تھیں۔ بانو جب میٹرک میں تھیں تو "ھنداره" اور ایف ایس سی میں تھیں تو "مات بنگڑی" چھپنے کے لئے تیار تھیں۔

تاہم تاج سعید کے ساتھ شادی ہو جانے کے بعد بانو کو قلم کے ذریعے مزید اظہار ذات کا بھرپور موقع ملا جس کا انہوں نے خاطر خواہ فایدہ اٹھایا۔ اگر ان کی شادی تاج سعید کی بجائے کسی دقیانوسی تنگ نظر شخص سے ہوئی ہوتی تو شاید آج تک بانو جیسی نڈر فنکارہ سسک سسک کر دم توڑ چکی ہوتی۔ اس حوالے سے بلاشبہ تاج سعید کا بانو پر نہ سہی پشتو ادب پر بڑا احسان ہے کہ انہوں نے بانو کے راستے کے کانٹے چنے اور اپنی رفاقت میں انہیں ادب کے راستوں پر چلنے دیا۔ ایوب صابر مرحوم والی بات کہ اگر بانو کسی غیر ادبی شخص کے پلے باندھی جاتی تو آج اس کے پچاس بچے اور چار افسانے ہوتے جبکہ اب وہ چار بچوں کی ماں اور 87 افسانوں کی مصنفہ ہے۔

سرحد کے ادبی حلقوں میں اس ادبی جوڑے کے ذہنی ارتباط کو کافی رشک کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ ممتاز ادیب اور ناول نگار رحیم گل نے ان دونوں میاں بیوی کو "سقراط بقراط" کے نام سے موسوم کیا ہے یہ مضمون اس کتاب میں شامل ہے۔

ایک بار تاج سعید نے بڑے پچھتاوے اور دکھی انداز سے کہا "قند" نے مجھے کیا دیا؟
رضا ہمدانی صاحب نے فوراً کہا۔ "قند نے تجھے بانو دی۔ ناشکری مت کر"

اولاد:

زیتون بانو اور تاج سعید کے چار بچے ہیں۔ دو بیٹے۔ دو بیٹیاں۔ چاروں بچے مروجہ تعلیم سے آراستہ و پیراستہ ہیں۔

1۔ نصیر الدین آذر سعید ایم ایل آئی ایس سی (MLISC) اور ایم۔ اے (اردو)
2۔ افشاں بانو سعید ایم۔ اے (اسلامیات) بی ایڈ۔ ایم ایڈ
3۔ کہکشاں بانو سعید ایم۔ ایس۔ سی (فزکس) بی ایڈ۔ ایم ایڈ
4۔ ظہیر الدین بابر سعید ایم بی۔ اے۔ آئی ٹی

نصیر آذر اکیڈمی آف لیٹرز اسلام آباد میں لائبریرین ہیں۔ افشاں اور کہکشاں پشاور پبلک سکول اینڈ کالج میں لکچرر کی پوسٹ پر کام کر رہی ہیں۔ ظہیر بابر ابھی کسی اچھی ملازمت کی تلاش میں ہے۔ فی الحال ایک نجی ادارے میں کنٹریکٹ پر ہیں۔

یہاں دلچسپ امر یہ ہے کہ کہکشاں کے علاوہ باقی تینوں بچوں کی شادیوں کے بعد بھی محترمہ باتو نے ان سے مزید ڈگریوں کے حصول کے لئے امتحان دلوائے۔ جس رات کومہندی کی رسم ادا ہونی تھی صبح نصیر آذر کا ایم اے اردو کا زبانی پرچہ ہوا تھا۔ افشاں کی دوسری بچی صرف 23 دن کی تھی جب اس نے ایم ایڈ کا پہلا پیپر دیا۔ ظہیر بابر نے بھی شادی کے بعد ماں کے بار بار کے تقاضوں کے آگے ہتھیار ڈال کر ایم بی اے آئی ٹی زرعی یونیورسٹی پشاور سے نمایاں درجے میں پاس کی۔ بابر نے اپنے بیچ میں یونیورسٹی میں تھرڈ پوزیشن حاصل کی۔

ملازمت:

زیتون باتو کئی سرکاری اور نجی سکولوں میں درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ رہی ہیں۔ ریڈیو پاکستان میں پروڈیوسر کے فرائض بھی ادا کئے ہیں۔

ان کی پہلی تعیناتی مالا کنڈ ایجنسی کے گورنمنٹ ہائی سکول تھانہ برائے طالبات میں ہوئی تھی۔ باتو کا قیام بھی وہیں سکول میں تھا۔ اس دوران گاؤں سے ان کی ایک قریبی رشتہ دار آئی تھیں رات بھی یہیں گزاردی مگر باتو نظر نہیں آئیں ماں سے پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی تو چار سالہ نواسی رخسانہ سے رازداری سے پوچھا "باتو گئی کہاں ہے؟؟" بچی نے بتایا "تھانہ میں ہے" اور ننھی رخسانہ کی بات افسانہ بن کر گاؤں میں پھیلی کہ سلطان محمود کی بیٹی زیتون باتو معلوم نہیں کس جرم کی پاداش میں کسی پولیس تھانے میں قید ہے۔ چنانچہ سپینہ وڑی سے شہر ان کے گھر تک کوچی خواتین کا ایک تانتا بندھ گیا جو کافی دنوں تک جاری رہا۔ ماں نے باتو کو لکھا کہ وہ گھر واپس آجائے کہ لوگ الزام تراشیوں پر اتر آئے ہیں مگر والد نے آنے سے منع کر دیا۔

1962ء میں زیتون باتو صاحبہ مالا کنڈ مڈل سکول کی ہیڈ مسٹریس مقرر ہوئیں۔ 1963ء میں ان کی شادی تیار تھی وہ ماں کے کہنے پر استعفیٰ دیکر پشاور واپس آئیں شادی کے چند ماہ تک جوں توں کر کے تاج سعید کی ایک سو پچاس روپے ماہانہ تنخواہ میں گزر گئے۔ مکان کا کرایہ بھی تھا۔ دونوں نے مانا کہ اس طرح گزر بسر نہایت مشکل ہے چنانچہ پیر پیائی گورنمنٹ گرلز مڈل سکول میں ہیڈ مسٹریس کا چانس ملا اور باتو تاج کا ہاتھ بٹانے میں لگ گئیں۔ یہاں باتو صاحبہ نے عربی فارسی کے ساتھ ساتھ سکول میں پشتو کو بھی ایک مضمون کی حیثیت سے جاری کیا۔ چونکہ لڑکیاں پشتون تھیں لہٰذا پشتو زبان پڑھنے لکھنے میں سب نے دلچسپی دکھائی۔ اس سال سکول کا مڈل کے بورڈ کا رزلٹ 98 فیصد رہا اس سے قبل بورڈ کا رزلٹ 50

بعد سے بھی کم ہوا کرتا تھا۔ محکمہ تعلیم نے کوئی توصیلی سند دینے کی بجائے بانو کے ہاتھ میں ڈی۔ آئی۔ خان کے ایک قصبہ ''پروا'' مڈل سکول میں تبادلے کا آرڈر تھما دیا۔ پروا بورڈ کا نتیجہ سو فی صد رہا۔ بانو کا تبادلہ گورنمنٹ مڈل سکول مردان ہوا وہاں بھی بورڈ کا نتیجہ 97 فی صد رہا۔ بعدازآں زیدہ ضلع صوابی میں مڈل سکول کی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ دو گورنمنٹ پرائمری سکول بھی ان کی نگرانی میں سرکاری طور پر سونپ دیئے گئے۔

یہاں زیدہ میں بانو صاحبہ کو ایک حادثہ یہ پیش آیا کہ پشتو کے ایک شاعر اور ڈرامہ نویس عبداللہ جان اسیر کی بیٹی فہمیدہ اسیر بھی تبدیل ہو کر آئیں مگر بانو کو اتنا تنگ کیا کہ بالآخران کو نوکری چھوڑنی پڑی۔ بانو کو فہمیدہ اسیر کی کئی نفسیاتی کمزوریوں کا پتہ بھی چلا ایسے کردار ہمدردی کے مستحق ہوتے ہین ان پر ترس ہی کھایا جاسکتا ہے۔

ریڈیو کی ملازمت :

غالباً 1966ء کا وسط تھا۔ ریڈیو پاکستان کو پروگرام پروڈیوسر کی ضرورت تھی۔ بانو صاحبہ نے بھی درخواست دے ڈالی۔ اس وقت مشرقی پاکستان ہمارا ایک صوبہ تھا۔ پورے پاکستان سے تقریباً ڈیڑھ سو امیدواروں نے انٹرویو دیا یہ انٹرویو راولپنڈی میں لیا گیا جس میں زیتون بانو ٹاپ پر رہیں مگر شومئی قسمت کہ یہاں بھی ان کی راہ میں ایک اڑچن آن پھنسی۔

نوکری کے لئے عمر کی حد تیس برس تھی اور محترمہ کی عمر تین ہفتے زیادہ بنتی تھی۔ دس ماہ تک اس سلسلے میں منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ اور ریڈیو کے محکمے کے مابین خط و کتابت ہوتی رہی۔ بانو اس نوٹا نائی سے بےخبر سب کچھ بھول بھال گئی تھیں کہ 12 اپریل 1967ء کو زیتون بانو کو Appointment Letter ملا۔ اور اس طرح وہ ریڈیو پاکستان کی پہلی پشتون خاتون پروڈیوسر بنیں اور پشاور سٹیشن پر ان کی تعیناتی ہوئی۔

کچھ عرصہ بعد جانے پہچانے شاعر اور ادیب جناب ضیاء جالندھری پشاور تشریف لائے ہوئے تھے۔ ضیاء جالندھری پروگرام پروڈیوسر نصرت شاہ کے بہنوئی اور اس بورڈ کے ایک فعال ممبر تھے جنہوں نے انٹرویو لے کر موزوں پروڈیوسر چنے تھے۔ مس نصرت شاہ اور زیتون بانو کا دفتر مشترک تھا۔ رسمی سلام دعا کے بعد ضیاء صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔

''آپ نے ریڈیو جوائین کرتے کیا دیر نہیں کردی؟؟''۔ بانو نے برجستہ کہا۔ ''سر!! دیر آید درست آید''۔

ضیاء جالندھری صاحب نے ایک زوردار قہقہہ لگایا Excellent آپ کے ایسے

ہی جوابات سے ہم بورڈ کے سارے ممبرز مرعوب ہو گئے تھے کہ آپ ڈیڑھ سو کنڈیڈیٹس میں نہ صرف ٹاپ پر رہیں بلکہ آپ کو کافی Age Relaxation (عمر کی رعایت) بھی ملی"۔

ورنہ منسٹری والے تو ایک دن کی رعایت دینے کے بھی روادار نہیں ہوتے۔ اس وقت پشاور سٹیشن کے چند پروڈیوسرز بھی دفتر میں موجود تھے۔ جن میں میثاق حسین زیدی، سید عبدالجبار (مرحوم) محمد اسحٰق خان مس نصرت شاہ اور کچھ دوسرے لوگ بھی شامل تھے۔

محترمہ زیتون بانو نے جب ریڈیو پاکستان پشاور کے پروگرام پروڈیوسر کی حیثیت سے چارج سنبھالا تو ان کو کافی بھاری بھرکم پورٹ فولیوز کا سامنا کرنا پڑا یعنی "سر منڈھاتے ہی اولے پڑے"۔ پشتو جنرل ڈرامہ ہفتہ وار "ژوند" (زندگی) ہفتہ وار فیچر پروگرام "لاروے" (راہ گیر) پندرھ واڑہ فیچر پروگرام، دخوئیندو پروگرام (بہنوں کا پروگرام) ہفتہ وار "باتور" (بہادر) بچوں کا ہفتہ وار پروگرام۔

بہنوں کے پروگرام میں "بانو خور" (بانو بہن) کی حیثیت سے حصہ لیتی تھی "بانو خور" ایک دیہاتن ان پڑھ عورت کا کردار تھا۔ پڑھی لکھی سمجھدار خاتون کا رول شمیم خان ادا کرتی تھیں۔ "باتور" پروگرام کی آپا جان بن کر بچوں کی ذہنی سطح کے مطابق ان سے مخاطب ہوتیں۔ اپنی لکھی ہوئی بچوں کی اخلاقی کہانیاں سناتیں۔ پروگرام کے "گل لالا" (بھائی جان) شہزادخان جوہر بنتے جو ریڈیو کے سٹاف آرٹسٹ تھے۔ دھیمے لہجے کے ایک اچھے شاعر اور امیر حمزہ خان شنواری کے بھتیجے تھے۔ ان کا ایک نغمہ بڑا مشہور ہوا ہے۔

بیادې په زلفانو کښې آشنا ګلونه وینمه
تورو تورو شپو کښې څه رنګین خوبونه وینمه

ترجمہ:

(زلفوں میں پھول پھر سجے ہیں تب ہی کالی راتوں میں رنگیں خواب نظر آرہے ہیں)

سن پچاس ساٹھ کی دہائیوں میں ریڈیو پاکستان کا سٹیشن خواتین ڈرامہ آرٹسٹوں کے لحاظ سے ایک طرح سے تہی دامن تھا۔ کوئی مرد صداکار کبھی آواز بدل کر عورت بننے کی ناکام کوشش کرتا۔ جس پر سامعین اپنے خطوں کے ذریعے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے۔ یا پھر گانے والی فنکاراؤں سے کام چلایا جاتا۔ ان میں اس وقت کی بہترین گائیک حبیب جان، چشتی چمن جان، بادشاہ زرین جان، اور دوسری گائیکاؤں کو آزمایا جاتا۔ محترمہ سیدہ قانتہ بیگم اور ان کی ہمشیرہ سیدہ صادقہ بیگم جیسی معمر خواتین سے بھی پشتو

راے میں بصد مجبوری صدا کاری کروائی جاتی۔ غیر پشتون خواتین آرٹسٹوں سے جو تھوڑی بہت پشتو
نتیں، پشتو پروگراموں میں ان سے بھی کام لیا جاتا تھا جن کی پشتو ادائیگی غیر مانوس لہجے میں ہوتی۔
ی آرٹسٹوں میں مرینہ تاجک، ان کی خالہ محمودہ بیگم اور رضیہ خانم نے پشتون نہ ہوتے ہوئے بھی پشتو کی
دمت کی۔۔۔۔ چنانچہ ایسی صورت حال میں بانو کو پروڈکشن کے ساتھ ساتھ پشتو ڈراموں میں خود صدا
کاری بھی کرنی پڑتی تھی۔

1949ء کا واقعہ ہے بانو والد کی اجازت سے اپنی چند سہیلیوں رضیہ، ثریا، عظمت اور ریحانہ کے
ساتھ، جن کا آڈیشن ہوتا تھا، ریڈیو سٹیشن کی سیر کرنے گئی۔ اس وقت زیتون بانو کی عمر گیارہ برس تھی ماں
کے حکم سے برقعہ پہن کر جانا پڑا برقعہ بھی پڑوسن کا مانگا ہوا جو پاؤں میں پھنسا اور بانو سٹوڈیو نمبر 1 کے
گیٹ کے سامنے دھڑام سے زمین پر ڈھیر ہوئیں۔ یہ ریڈیو پاکستان پشاور کی پرانی بلڈنگ کی بات تھی۔

پروڈیوسر شوکت اللہ خان اکبر مرحوم نے لڑکیوں کا آڈیشن لیا تو آخر میں بانو سے بھی کہا
''ککنئی!! تہ هم ټسټ ورکړه کنه !!(کاکی!! تم بھی ٹسٹ دیدونا)۔

اس زمانے میں خواتین آرٹسٹوں کے لئے ایک دو صوفوں کے پیچھے الگ مائیکروفون رکھا ہوتا تھا۔ خواتین
آرٹسٹس مائیکروفون کے آگے بیٹھ کر ہی اپنے برقعے کا نقاب اٹھا لیتی تھیں۔ ادھر پردے کے پیچھے بیٹھی ہوئی
کا کام ختم ہوا ادھر پھر نقاب گرایا گیا۔ بانو بھی کافی عرصہ برقعہ پہنے نقاب گرائے پروگراموں میں حصہ لیتی
ہیں۔ ایک بار ایک سامع نے لکھا کہ ''ڈرامے کی ہیروئین ہیرو کی بیٹی لگ رہی تھی''۔ ہیروئین عموماً بانو بنتی
تھیں اور ہیرو کا رول عبداللہ جان مغموم ادا کرتے تھے۔ یہ بھی ریڈیو کے ملازم تھے جو کنٹریکٹ پر تھے۔
بعد میں پرمننٹ ہو گئے تھے۔ اسی میدان میں تمغہ حسن کارکردگی حاصل کیا۔ میرمن زیتون بانو ایک جر
ات مند پشتون عورت ہیں۔ یہی اصول انہوں نے ریڈیو کی ملازمت میں بھی بڑے وقار سے اپنایا۔ ایک
بار ہیڈکوارٹر سے حسب قاعدہ ایک ڈائیریکٹو (Directive) آیا۔ سینئر پروڈیوسر عمر ناصر صاحب نے
بانو کو مارک کیا جس میں ہدایت تھی کہ Male and Female issue پر ہر سٹیشن مختلف پروگرام
پیش کرے۔ زیتون بانو کے پاس جنرل ڈرامے کا پورٹ فیلیو بھی تھا۔ اس دوران امیر حمزہ شنواری کا لکھا
ہوا ڈرامہ ''نجمہ'' آیا رکھا تھا۔ یہ ایک رومانوی کہانی تھی۔ بانو نے ناصر صاحب کی اجازت سے ''نجمہ''
ڈرامے کی کہانی اس طور بدلی کہ وہ میل فی میل ایشو پر ایک بھرپور کوشش بن کر براڈکاسٹ بھی ہوئی پسند
بھی کی گئی۔

ایک دن معلوم ہوا کہ حمزہ صاحب ریڈیو سٹیشن تشریف لائے ہیں۔ بانو خاصی گھبرائیں کہ حمزہ صاحب

کی اجازت کے بغیر ان کا ڈرامہ کوئی اور صورت اختیار کر چکا تھا جو ایک نا قابل معافی جرم بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ عمر ناصر صاحب نے حقیقت بتا دی۔" وہ مسکرائے۔فرمایا" کیا کہا جائے بانو تو بانو ہے۔سزا کے لائق تو نہیں ہو سکتی نا!!!"

پروفیشنل گرجز (پیشہ ورانہ چشمک) ہر محکمے میں ہوا کرتے ہیں۔چنانچہ حمزہ صاحب ہی کا ایک بہت مشہور ڈرامہ "کور محلت" (پڑوس) بہنوں کے پروگرام میں چلنا تھا۔ بکنگ ہو چکی تھی۔ پتہ چلا کہ ماسوائے ایک آخری صفحے کے باقی تمام سکرپٹ لائبریری سے غائب ہے۔بانو نے حوصلہ نہیں ہارا۔نہ ہی انجانے دشمن سے ہار مانی۔چونکہ وہ خود اس ڈرامے میں کئی بار مرکزی کردار ادا کر چکی تھیں۔چنانچہ بڑی رازداری سے اپنے گھر بیٹھ کر "کور مالت" کا نیا سکرپٹ لکھ کر بہنوں کے پروگرام میں پیش کیا۔مگر اب کی بار بانو نے سینئر پروڈیوسر عمر ناصر صاحب کو بھی کانوں کان خبر نہ ہونے دی وہ پرکھ چکی تھیں کہ عمر ناصر صاحب پیٹ کے ذرا ہلکے ہیں۔

میر من زیتون بانو کے ہر ہفتے پانچ پروگرام آن ائیر جایا کرتے تھے۔

1968ء میں وہ پروڈیوسر کی مزید ٹریننگ کے لئے کراچی چلی گئیں۔جانے سے قبل انہوں نے 13 نئے ڈراموں کا شیڈیول بنا کر اپنے سینئر پروڈیوسر عمر ناصر صاحب کے حوالے کیا۔کراچی میں شمس الدین بٹ صاحب ٹریننگ سنٹر کے پرنسپل تھے ایک روز لیکچر کے دوران بتایا کہ ریڈیو کیلئے ڈراموں کا شیڈیول بناتے ہوئے چھ یا سات نئے ڈرامے بھی شیڈیول میں شامل ہوں تو یہ بہترین شیڈیول کہلاتا ہے۔بانو نے فخر سے بتایا۔۔۔" میں 13 نئے ڈراموں کا شیڈیول پشاور دے کر آئی ہوں۔" اس پر بٹ صاحب نے کہا۔۔۔" پھر تو آپ کو سپیشل سرٹیفکیٹ ملنا چاہئے"۔۔مگر بانو کو زبانی شاباش تک بھی نہیں ملی۔

شیڈیول میں آنے والے تین مہینوں میں کسی بھی نشر ہونے والے پروگراموں کو ترتیب دینا ہوتا ہے۔ سنا ہے اب اس پابندی کو اتنا درخور اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔

بانو کو پشتو میوزک کا پورٹ فیلیو چلانے کا موقع بھی ملا تھا۔رفیق شنواری مرحوم میوزک کمپوزر تھے گویئے پروگرام سے ایک روز قبل ریہرسل کے لئے آیا کرتے تھے۔"معشوق سلطان (پرائیڈ آف پرفارمنس) حسب قاعدہ ریہرسل کیلئے نہیں آئیں۔دوسرے دن صبح صبح آ گئیں۔۔۔"جی!۔۔۔نو دن ہوئے میرا ڈیڑھ سال کا بچہ فوت ہوا ہے۔" ان کی آنکھوں میں اشکوں کے سمندر ٹھاٹھیں مارتے نظر آئے مگر وہ پی گئیں اور میں سارا دن یہی سوچتی رہی کہ ایک دکھیا ماں ریڈیو پر سارا دن گانے کس دل سے گائیگی!!"

فنِ صدا کاری :

ریڈیو کا ماحول محترمہ بانو کے لئے قطعی نیا نہیں تھا۔ وہ 1949ء سے ثریا بیگم کے فرضی نام سے پشتو پروگراموں کی آرٹسٹ تھیں۔ پروڈیوسر شوکت اللہ خان اکبر مرحوم نے انکا آڈیشن لیا تھا۔ جب نام پوچھا گیا۔ "کا کی!! تمہارا نام کیا ہے؟" تو بانو اپنا نام بتانے سے ہچکچائی۔ شوکت اللہ اکبر مرحوم نے ثریا بیگم نام تجویز کیا۔ وہ اسی نام سے کافی مدت تک پروگراموں میں حصہ لیتی رہیں۔ فوج سے ریٹائرمنٹ لے کر احسان اللہ خان دانش ریڈیو پروڈیوسر بن کر آئے تھے انہوں نے بانو کو اپنا ہی نام زیتون بانو دے ڈالا۔ دانش (مرحوم) انکے پڑوسی رہ چکے تھے اور بانو کو پیشو (بلی) کہہ کر بلاتے تھے۔ دانش صاحب نے ایک اور کام یہ کیا تھا کہ خواتین آرٹسٹوں کے لئے الگ مائیکروفون رکھوانے کا رواج ختم کر کے مرد اور خواتین صدا کار ایک ہی مائیکروفون پر اپنے فن کا اظہار کرنے لگے۔ بانو کے والد پیر سلطان محمود شاہ بھی پشتو پروگراموں میں حصہ لیتے رہتے تھے۔

زیتون بانو صاحبہ نے گیارہ سال کی عمر سے پروگراموں میں حصہ لینا شروع کیا تھا۔ بے شمار ڈراموں، فیچروں، بچوں اور خواتین کے پروگراموں میں بانو کو بھرپور شرکت کے مواقع ملے۔ ایک تو خواتین فنکاروں کی کمی تھی دوسرے بانو کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فن کا ملکہ ودیعت ہوا ہے۔ وہ فن صدا کاری اور ادا کاری میں خداداد صلاحیت کی مالک ہیں۔ وہ کسی بھی ریڈیو ڈرامے کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتیں۔ اکثر پروڈیوسران کو انعامی مقابلوں کے ڈراموں میں نکالنا نیک فال سمجھتے۔ اتفاقاً جس ڈرامے میں بانو صاحبہ نے صدا کاری کی ہوتی وہ ڈرامہ کوئی نہ کوئی انعام ضرور لے جاتا۔ پشاور کے ایک پروگرام ایف ایم کے ڈائریکٹر ظاہر شاہ آفریدی صاحب نے ایک دو بار اس کا اظہار بھی کیا تھا ساتھ یہ بھی مانا کہ محنت آرٹسٹ کر لیتے ہیں انعام پروڈیوسر لے اڑتا ہے۔

محترمہ زیتون بانو کو اب بھی پروگراموں میں شرکت کی دعوت دی جاتی ہے مگر وہ معذرت کر لیتی ہیں۔ وجہ پوچھی گئی تو بتایا۔ "نئی نسل کو بھی آگے بڑھنے کا موقع ملنا چاہیے۔"

فنِ ادا کاری :

میرمن زیتون بانو کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ "آغوشِ کوہستان" نامی ٹی۔ وی کے پروگرام میں ٹیلی

کاسٹ ہونے والے پہلے پشتو ڈرامے میں انہوں نے حصہ لیا۔مزے کی بات یہ ہے کہ اس ٹی وی ڈرامے کی کہانی زیتون بانو ہی کے ایک افسانے پر مبنی تھی۔لیکن بیگم اسے داؤد کے نام سے اسے منسوب کیا گیا تھا۔بانو نے اس حقیقت کا اظہار جب کیا تو ڈرامے کے پروڈیوسر شہزاد خلیل مرحوم نے بانو کے آگے ہاتھ جوڑے۔۔۔

''باجی!!۔۔خدارا خاموش رہیے۔میری نوکری کا سوال ہے۔۔۔''

اور''باجی'' چپ رہیں مگر مرکزی کردار بانو ہی سے ادا کروایا گیا۔بانو کے بیٹے نصیر آذر نے بھی اس ڈرامے میں بچے کا کردار نبھا کر چیک کے ساتھ کافی داد بھی وصول کی۔

ہوتا یوں تھا کہ شہزاد خلیل بمعہ اپنے سٹاف اور آرٹسٹوں کے پشاور آجاتے تھے پشاور کی پشتون خواتین آرٹسٹ جو کام کر رہی ہوتی تھیں وہ کسی ہوٹل وغیرہ میں جانے سے کتراتی تھیں۔بانو صاحبہ کا گھر ایک محفوظ جگہ تھی۔بانو اور تاج سعید نے ان کو یہ سہولت بھی دی تھی کہ انکے کھانے پینے کا بندوبست بھی اپنے ذمے لیا ہوا تھا۔ارباب خان اس وقت پشاور میں پروڈیوسر تھے وہ جب بھی بانو سے ملے یہ ضرور کہا ۔۔۔''بھابی!! آپ کے ہاتھ کے پلاؤ اب بھی یاد آرہے ہیں۔۔۔''ان لوگوں میں نسیم جان بھی شریک ہوتے جو عموماً ہندکو پروگرام پروڈیوسر کیا کرتے تھے۔

ریہرسلیں بانو کے گھر پر ہوتی تھیں مگر ریکارڈنگ کے لئے پنڈی جانا پڑتا تھا۔تب ٹی وی کا اپنا سنٹر نہیں بنا تھا۔پنڈی میں کرائے کے کسی بنگلے میں بندوبست کیا گیا تھا۔

محترمہ بانو کے ایک مشہور افسانے''زندہ دکھ'' کا پلاٹ اور''لوہے کے چنے افسانے کی پوری کہانی پر مبنی ایک ڈرامہ بھی سرقے کی ذیل میں آتا ہے بلکہ بانو صاحبہ اسے دیدہ دلیری کہتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے۔

> ''پشاور ٹی وی کے پرانے سنٹر کی بات ہے جی ایم صاحب نے مجھے بڑے فخر سے بتایا کہ اب کی بار ہم ایک ایسا پشتو ڈرامہ ریکارڈ کر چکے ہیں جس میں بالکل نئی ہوا کا ایک تازہ جھونکا آپ کو محسوس ہوگا۔''

اور جب ڈرامہ ٹیلی کاسٹ ہوا تو''زندہ دکھ'' کے پلاٹ پر مبنی تھا جو پشاور کے ایک مشہور کالم نویس، ہندکو پشتو کے شاعر اور ڈرامہ نگار نے لکھا تھا بانو نے رائیٹرز رائٹ کے ایکٹ کے تحت (جو اس وقت تک لاگو تھا) دعویٰ دائیر کرنے کا فیصلہ کیا۔لیکن پشتو کے ایک ادیب خالقداد امید بیچ میں آپڑے۔ہمیں

منانے کے لئے جرگہ لانے کی بات بھی کی۔ان موصوف کی طرف سے معافی بھی مانگی۔میرا مطالبہ تھا کہ جس اخبار میں کام کر رہے ہیں اسی کے ذریعے تحریری معافی نامہ چھپوائیں۔مگر ایسا اس لیے نہیں ہو سکا کہ تاج نے شوہرانہ حقوق استعمال کر کے مجھے بھی درگزر سے کام لینے پر مجبور کیا۔اب یہ ہے کہ جب ان سے کسی تقریب میں آمنا سامنا ہو جاتا ہے تو ان کی پیشانی پر شرمندگی کی کئی لکیریں ابھرتی نظر آتی ہیں اور مجھے اندر سے ایک گونہ سکون مل جاتا ہے۔کیا یہ کم سزا ہے؟

دوسرا واقعہ بھی اسی پشاور ٹی وی سنٹر کا ہے۔''لوہے کے چنے'' افسانہ ڈرامے کی شکل میں ٹیلی کاسٹ ہوا۔مجھ سے پوچھنے کی ضرورت محسوس کی گئی تھی اور نہ ہی ڈرامے یا کہانی پر میرا نام دیا گیا تھا۔اس زمانے کے پی ایم طارق سعید صاحب سے احتجاج کیا تو اول تو آئیں۔بائیں شائیں کرتے رہے مگر میں مصر تھی کہ ایسا کیوں کیا گیا؟۔آخر کار زک ہو کر فرمایا۔'' آپ نے افسانہ لکھا چھپوایا آپ کا افسانہ اب صرف آپ کا نہیں رہا ہے۔بلکہ اس پر پڑھنے والوں کا حق زیادہ بنتا ہے۔اب یہ پبلک پراپرٹی بن چکا ہے۔''

''اور میں اپنے حق سے دستبردار ہو گئی۔''

اباسین آرٹس کونسل کی پرانی بلڈنگ کے سٹیج پر ''بڑے صاحب'' ڈرامے میں بانو نے کام کیا۔یہ پہلی بار ہوا تھا کہ صوبہ سرحد میں سٹیج پر کسی خاتون نے کسی عورت کا کردار ادا کیا ورنہ اس سے قبل کسی خوبرو جوان کا حلیہ بدل کر اس سے کام لیا جاتا تھا۔

بانو جونہی سٹیج پر نمودار ہوئیں نیچے بیٹھے ہوئے تماشبیوں میں نانا کی گود میں بیٹھا ہوا بانو کا چھوٹا بیٹا بوبی (بابر) چیخ اٹھا۔''امی!!۔امی زہ ھم راخم''(امی۔امی میں بھی آتا ہوں)

ریڈیو، ٹی وی اور سٹیج کے علاوہ محترمہ بانو تین اردو اور ایک پنجابی فلم کے ڈائیلاگز اپنی آواز میں پشتو میں ڈب کروا چکی ہیں۔بانو نے ''ارمان'' فلم تن تنہا پشتو میں اسطرح ڈب کروائی تھی کہ ہیروئن کے علاوہ آٹھ کے قریب مزید خواتین کرداروں نے فلم میں جو جو مختلف ڈائیلاگز بولے تھے وہ بھی آواز بدل بدل کر پشتو میں ڈب کروائے۔''ارمان'' فلم کی ڈبنگ کے لئے تین دن تک ہال بک تھا۔مگر بانو ڈھائی تین گھنٹے میں کام مکمل کر کے لاہور سے پشاور اپنے شوہر تاج سعید کے ہمراہ واپس لوٹیں۔اس زمانے کے حساب سے فلم کی ڈبنگ کے لئے مناسب معاوضہ دیا جاتا تھا۔

محترمہ بانو کو ایک فلم ''امراؤ جان ادا'' میں امراؤ کی ماں کے کردار کی پیشکش بھی ہوئی تھی لیکن ان کے بڑے بیٹے نصیر آذر نے، جو کالج سٹوڈنٹ تھا، اعتراض کیا کہ ''ٹی وی میں کام کرنا الگ بات ہے مگر

امی کا فلم میں کام کرنے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا۔"

بانو نے بتایا۔"میں نے بیٹے کی بات مان لی اور انکار کیا۔ درحقیقت میں اس کی مردانگی کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتی تھی حالانکہ تاج نیم راضی تھے۔

مشہور ناول نگار اور افسانہ نگار رحیم گل (مرحوم) فلمی دنیا سے بھی وابستہ تھے ان کی ایک متوقع فلم (تور دلے شہی) کے لئے رحیم گل صاحب نے محترمہ زیتون بانو کو مختلف Situations بھجوا کر گانے لکھوائے تھے۔ معلوم نہیں "امراؤ جان ادا" اور "تور دلے شہی" کی قسمت کا کیا بنا۔

ریڈیو کے پشاور سٹیشن پر بانو پروڈکشن کے کام کے ساتھ ساتھ ایک رائیٹر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیتی رہیں۔ ہفتہ وار دو فیچر لکھنا۔ آئے ہوئے ڈراموں کو اکثر حالات میں خود دوبارہ لکھنا۔ خواتین اور بچوں کے پروگراموں کے سکرپٹ لکھنا۔ کہ اس زمانے میں ایک لفظ بھی بغیر لکھے ریڈیو پر نشر نہیں ہو سکتا تھا۔ ہر سکرپٹ چیک ہو کر آن ائیر جاتا تھا۔ آج کل ایسا نہیں ہوتا۔

اور پھر یہ سارے پروگرام خود پرڈیوس کرنا بانو جیسی عورت کے لئے جو ایک گھر ہستن بھی تھی۔ بیوی بھی تھی اور ماں بھی، مشکل ضرور تھا مگر ناممکن نہیں تھا اس پر طرۂ یہ کہ بڑی ہمت، جرأت اور وقار کے ساتھ مشرقی معاشرے کے مردوں کے دوش بدوش اپنے فرائض کی ادئیگی میں جتی رہیں۔

دازمانه چرته څوک وړاندې پرېږدي/بانو هر کام ډېر په هنرا لینے دے

ترجمہ:

(یہ زمانہ کب کسی کو آگے بڑھنے دیتا ہے۔ بانو نے ہر قدم بڑے ہنر سے آگے بڑھایا ہے)

یہ وہ وقت تھا جبکہ تاج سعید ریڈیو پشاور میں Contract Basis پر سکرپٹ رائیٹر تھے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ بانو ریڈیو کی بھاری ذمہ داری کے ساتھ اپنے گھر بار بچے اور رشتہ داریاں سنبھالتے سنبھالتے اپنی صحت سے لاپرواہ ہوتی جا رہی ہے۔ چنانچہ شوہر کی خواہش پر ریڈیو سروس سے استعفیٰ دے کر گھر پر نہیں بیٹھیں بلکہ 1973ء سے 1998ء تک پشاور پبلک سکول اینڈ کالج ورسک روڈ میں 17 گریڈ میں تدریس کے مقدس کام میں مصروف رہیں۔ 18 جون کو زیتون بانو صاحبہ ریٹائیر ہوئیں اور اس سال یکم جولائی 1998ء سے ان کے بیج (Badge) کی ٹیچرز کو فورسیز قانون کے تحت

18 گریڈ میں ترقی ملی۔ بانو بتا رہی تھیں۔

"میں کبھی تین ہفتے آگے نکل گئی کبھی بارہ دن پہلے چھٹی کرا دی گئی مگر کوئی رکاوٹ ہراساں نہ کر سکی۔"

سروس زیادہ نہیں تھی پنشن کی سہولت بھی نہیں ملی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اسی سکول میں تین ہزار روپے ماہانہ فکسڈ پر اور پھر ساڑھے چار ہزار ماہانہ پر ایک پرائیویٹ سکول و کالج میں تدریسی خدمات انجام دینے لگیں مگر وہاں کے ماحول سے میر من زیتون بانو کی طبع نے لاگا نہ کھایا تو نوکری چھوڑ دی اور اپنا ایک ذاتی سکول کھول کر چھ سال تک چلایا مگر عمر اور صحت دونوں مزید آگے کام کرنے میں حائل ہوئیں۔ دوسری بنیادی وجہ یہ بنی کہ سکول کا تعلیمی ریکارڈ تو بہترین تھا مگر چولہے ہنڈیا کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ بانو نے علاقے کی پس ماندگی کو مدنظر رکھتے ہوئے صرف سو روپے ماہانہ فیس رکھی تھی مزید کوئی اور فنڈ نہیں لیتی تھیں۔ لہٰذا سکول بند کرنا پڑا۔

زیتون بانو نے ایک جگہ پر ٹِک کر نوکری نہیں کی۔ اس میں ان کی متلون مزاجی کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ مختلف اداروں میں کام کرنے سے متعلق بانو صاحبہ کا اپنا ایک الگ نظریہ ہے۔ وہ کہتی ہیں۔

"کسی ایک جگہ ٹِک کر بڑے گریڈ میں ریٹائر ہونے سے کیا یہ بات بہتر نہیں تھی کہ بھانت بھانت کے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان سے ملتی رہی ہیں صرف رسالے کتابیں نہیں پڑھا کرتی بلکہ لوگوں کو بھی پڑھتی رہتی ہوں بہت پڑھے لکھے سکالرز کم پڑھے لکھے وضع دار دانشور، ان پڑھ انسان اور پڑھ لکھے جاہل بلکہ جانور نما انسان بھی ملے جو اپنی ملی ہوئی ڈگریوں تک ہی محدود رہتے ہیں وہ کسی اور کو کیا دیں گے؟

ریڈیو کی پروڈیوسری کرتے ہوئے پتہ چلا کہ ایک پروڈیوسر اپنے فنکاروں، آرٹسٹوں اور لکھاریوں کا کس قدر محتاج رہتا ہے۔ اس کی افسری ان ہی Talents کی مرہون منت ہوتی ہے۔

مختلف امراض نے رنگ رنگ کے ڈاکٹرز پیدا کیے مگر کیا کوئی بڑے سے بڑا ماہر ڈاکٹر مریضوں کے بغیر کامیاب ڈاکٹر کہلایا جا سکتا ہے؟؟۔

ڈاکٹر بھی اپنے مریضوں اور ان کے امراض کا محتاج ہے۔"

تخلیقی سفر :

میر من زیتون بانو کے والد انکو ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے مگر روایات نہ سہی ان کی بیماری کسی حد تک راہ کی رکاوٹ بن گئی اور بانو ایم بی بی ایس ڈاکٹر نہ بن سکیں مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی قسمت میں مسیحائی رقم کر دی تھی لہٰذا آپ ادیبہ بن کر معاشرے کے ناسور پھوڑتی رہیں۔

تاج سعید کے ساتھ شادی ہو جانے سے قبل ہی بانو کی تخلیقات کا آغاز ہو چکا تھا۔ جب وہ دسویں میں تھیں انکا پہلا پشتو افسانوی مجموعہ "ہندارہ" کے نام سے اشاعت کے لئے تیار تھا۔ اسے عبدالخالق خلیق مرحوم نے اپنے دیباچے کے ساتھ شائع کرایا۔ وہ اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

پیژند گلی(تعارف)

زیتون بانو وړومبئ پیغله ده چاچې په نثر کښې دپښتو ژبې یوشاندار خدمت اوکړو. "هنداره" په پښتو ادب کښې یوه قابل قدر اضافه ده...... ...... دپښتو ژبې اکثر چاپ کتابونه په نظم کښې وی.. دشمیریو څو کتابونه په نثر کښی هم چاپ شوی دی...خودهنداری مقام که دنوررونه اوچت نه دے لوکم هم نه دے...

دیوې پرده دارې پښتنې جینئ د قلم دا سې دَفن په تمامو لوازمو پوره دا کتاب دډیرې ستائینې وړدے....

دبانو په ادبی دنیا کښې خودا وړومبے قدم دے مګر په وړومبی ځل دا سی کامیاب قدم کیښودل ددې خبرې غمازی کوی چې که بانو دَ نظره نه شوه نو د پښتوادب د آسمان یوځلیدونکې ستاره به ثابته شي..

دَ"هنداره"افادی حیثیت هم ډیرا وچت دے د نتیجې په لحاظ هره افسانه اوهره ډرامه کښې یئی یئولوئے اخلاقی سبق دے.. مکالمې یئی دمعنې ډکے او مختصر ې دی..دَ"هنداره "ژبه هم ډیره خوندنا که اولطیفه

ده..

بانو چونکه لاکرا وسه طالبعلم ده نود جینکو طالبعلمانو
نفسیات یئی پکښی په بنه سنجید ، درنه او معصومانه
انداز کنبی پیش کړی دی دداسې تقوی اظهار نه دے
شوے چی په عملی دنیا کنبې دهغې وجودنشته.. بس
دغه دعا مو شریفو جینکو کردار یئی پیش کړے دے
څو نکه چې پکار دے.

زه امید لرم چې "هنداره "به پښتانه خوښه کړی اوقدر به ئی
او کړی اوددې پېغلی خاتون حوصله به زیاته کړی ددې
دپاره چې ددې نه زیات ښه قلمی خدمت ته تیاره شی
اونورې لوستې جینکئی ددې تقلید او کړی..

عبدالخالق خلیق (پېښور 1958)

ترجمه :

تعارف

زیتون بانو پہلی پشتون دوشیزہ ہے جس نے پشتو کی اتنی شاندار خدمت کی۔"ہندارہ" پشتو ادب میں ب قابل قدر اضافہ ہے۔

پشتو زبان کی اکثر کتابیں نظم کی ہوتی ہیں۔ گنتی کی چند کتابیں نثر میں بھی چھپ چکی ہیں مگر"ہندارہ" کا ام اگر اوروں سے اونچا نہیں تو کم بھی نہیں ہے۔

ایک پردہ دار پشتون لڑکی کے قلم سے اس قبیل کے فن کے تمام لوازمات پر پوری یہ کتاب بہت ہی یادہ ستائش کے قابل ہے۔

بانو کا ادبی دنیا میں یہ پہلا قدم ہے مگر پہلی بار اس طرح کا کامیاب قدم رکھنا اس بات کی غمازی کرتا

ہے کہ اگر بانو کو کسی کی نظر نہ لگی تو پشتو ادب کے آسمان کا ایک درخشندہ ستارہ ثابت ہوگی۔

''هنداره'' کی افادی حیثیت بھی بہت بلند ہے۔ نتیجے کے لحاظ سے ہر افسانہ اور ہر ڈرامہ ایک بڑا اخلاقی سبق ہے، مکالمے بامعنی اور مختصر ہیں۔''هنداره'' کی زبان بھی بڑی بامحاورہ، پرکشش اور لطیف ہے۔

بانو چونکہ اب تک خود ایک طالب علم ہے لہٰذا دوسری طالبات کی نفسیات کو بڑی سنجیدگی، وقار اور معصومانہ انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپس کی بات چیت میں بے جا شرارت، گستاخی اور بیبا کی کا شائبہ تک نظر نہیں آتا اور نہ ہی کسی ایسے تقویٰ کا اظہار ہوا ہے جس کا عملی دنیا میں کوئی وجود ہی نہ ہو۔ بس یہی عام شریف لڑکیوں کا کردار پیش کیا گیا ہے جیسے چاہیے ہوتا ہے۔

مجھے امید ہے کہ ''هنداره'' پشتونوں کو پسند آئے گی اور اسے قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے تا کہ اس دوشیزہ کی حوصلہ افزائی ہو اور بانو پشتو ادب کی اور زیادہ قلمی خدمت کے لئے تیار ہو۔ مزید براں دوسری تعلیم یافتہ لڑکیاں بھی اس کی تقلید کریں۔

عبدالخالق خلیق (پشاور 1958ء)

زیتون بانو کی پہلی کتاب ''هنداره'' میں دو ڈرامے اور بارہ افسانے شامل ہیں نام کچھ یوں ہیں:

1۔	خره لفافه	(خاکی لفافہ)	ڈرامہ
2۔	کرم شوک دی	(قصوروار کون؟)	ڈرامہ
3۔	شاعر	-----	افسانہ
4۔	ټانګې وال	(کوچوان)	افسانہ
5۔	لیونئی	(پگلی)	افسانہ
6۔	تصویر	----	افسانہ
7۔	ګونګی پیریان	(گونگے جن)	افسانہ
8۔	تیلے	(تیلی)	افسانہ
9۔	دلشاده	(دلشاد)	افسانہ
10۔	دخلوپل	(بنکو کا پُل)	افسانہ

11۔	سترګې	(آنکھیں)	افسانہ
12۔	چپې	(لہریں)	افسانہ
13۔	دبیزوقبر	(بندر کی قبر)	افسانہ
14۔	لاس	(ہاتھ)	افسانہ

بانو کے پہلے افسانوی مجموعے "هنداره" کی چند کہانیوں کے اقتباسات اور اردو ترجمہ حاضر ہیں۔

اقتباس

"هسې خود هغې نور کړه وړه دلهولونه ووخوچی تهوس به توي اوکړو

"دلشادې هغه څوئے دې څه کړو؟"

"بی بی! هغه مې خرخ کړو"

"په څودې خرخ کړو"

"بی بی! په یوه آنه"

نویا خوبه دې داګمان پوخ شو چی په رشتیائو لیونئی ده.. اویابه درته ددې یوې آنې قیمت څه ډېرزیات بنکاره شو اوپه دې سوچ به مجبور شوئی چې دایوه آنه زمونږ په ژوندکښې څومره اهمیت لری!!

دلته ددلشادې سترګې را ډ کې شوې اوخوله ئې ورانه لاړه ماداسې محسوس کړه لکه زما د نظر په وړاندې دهغې ورانه خوله نه وه بلکه دیوې مور دنیا ورانه ویجاړه پر ته وی ...... دلشادې په ډېر کوشش خوله راغونډه کړه اودغاړې نه یې یوتعویذ را اوویستو ماته

يې رامخکنبې کړو... مااوويل...

"داولې"

"دا اوګوره !۔۔۔۔"

اوماچې پرانستو نوهغه تعويذ نه بلکه يوه آنه وه او...
هغه هم کوته ... ما کوته آنې ته او بيا دد لشادې کوته
تندې ته اوکتل اوچپ پاتې شوم شايد... دلشادې ته
داهم نه وه معلومه چې آنه کوته وه اوخوټې يئې په
کوته آنه خرڅ کړے دے..... هغې له سخته ژړا
ورغلې وه ... هغه سلګو اونيوله......

بې بې ! ژړا په دې راځې چې ماخوهغه بنځې ته داهم
اونه سنبودل چې دده نوم قسر ګل دے. هغه له خوخيله
نامه لا هم نه ورتله ...."

ترجمه :

"ویسے تو اس کے اکر بکر اور حرکتیں پاگلوں جیسی نہیں تھیں مگر اس سے جب پوچھا
جاتا کہ۔۔۔"دلشاد! بیٹا کہاں ہے؟" تو جواب دیتی "بی بی! اسے بیچ ڈالا۔"
"کتنے میں بیچا؟"
"بی بی! ۔ایک آنے میں۔"
تو یا تو یہ یقین کرنا پڑتا کہ واقعی پاگل ہے اور یا اس ایک آنے کی قیمت بہت زیادہ
لگتی اور یہ سوچنے پر بندہ مجبور ہو جاتا کہ یہ ایک آنہ ہماری زندگی میں کتنی اہمیت
رکھتا ہے۔۔۔
یہاں دلشاد کی آنکھیں بھر آئیں ۔ ہونٹ پھیل کر کانپنے لگے اور میں نے یوں
محسوس کیا جیسے میری نگاہوں کے سامنے اس کے ویران منہ کے پھیلے ہونٹ نہیں

بلکہ کسی ماں کی اجڑی دنیا کی گرتی دیواریں ہوں۔
دلشاد نے بڑی کوشش سے ہونٹ سکیڑ کو قابو کئے۔ گلے میں لٹکا ہوا تعویذ اتار کر
میری طرف بڑھایا۔ میں بولی۔۔۔یہ کیا ہے؟
"یہ دیکھ لو۔۔۔"
اور میں نے جب کھولا تو تعویذ میں ایک آنے کا سکہ تھا اور۔۔۔وہ بھی کھوٹا سکہ
۔۔۔میں نے آنے کو اور پھر دلشاد کے کھوٹے ماتھے کو نظر بھر کر دیکھا اور۔۔۔
چپ رہی۔۔شاید۔۔۔شاید دلشاد کو یہ بھی پتہ نہ ہو کہ آنہ کھوٹا ہے اور بیٹے کو
کھوٹے آنے کے عوض بیچ گئی ہے۔
اسے سخت رونا آیا ہوا تھا۔۔۔اور ہچکیوں نے آلیا۔۔۔بی بی!! رونا اس لئے آرہا
ہے کہ میں نے تو اس عورت کو بتایا ہی نہیں کہ اس لڑکے کا نام قمر گل ہے۔وہ تو
ابھی اپنا نام بھی بتا نہیں سکتا تھا۔"
(نوٹ: "دلشادہ" افسانے کا نام بدل کر اب "ایک آنے کا بیٹا" رکھا گیا ہے)

اقتباس .... "گونگي پيريان" (گونگے جن)

هو . زه چی سور رنګ اووينم نوماته وينه رامخکنې
شی.
وينه!! ماغلی شان دخان سره اووې اويه سرچ شوم. خو
بيامې زړه کلک کړو او پوښتنه مې او کړه.
وينه؟؟
هووينه ... سره وينه ... بوتښې بوتی وينه. هغې اووې
خووينه تاسوته څنګه رامخکنبی شی چاچی؟ دڅه وينه
. دچاوينه؟
ماتړې نه توليې پو بنتنې په يوواراو کړې.
ستا سو دخوئے وينه؟؟ دشفيق وينه
هو

هغې قيصه شروع کړه لکه چی هم دې قيصيې اوروړلو ته ليواله وې. خونظر يې چرته لرې په هوا کښې ښخ وو. لکه چی په خلا کښې دڅه ورک شی لټمون کوی او يا څه هير شوی واقعات راټولول غواړې.
شفيق يوه ورځ بهر ماشو مالو سره لاس اونګولو. دمحلت نبځې په ګيله راغلې ما کټوئی پخوله ....
دمسو څمڅئی مې په لاس کښی وه .... دشانه مې پرې ګزار اوکړو ... هغه ... هغه داپريوتو .... خولې نه ئې بوټئی بوټئی وينه ګزار کړه.... سره وينه ....
لکه لکه سور رنګ... په زمکه او تړ قيدو ساه يئی ورکړه...ماخپل خپل شفيق .... دخپله لاسه وژلے دے ... دخپله لاسه .... دخپله لاسه ... دخپله ....''
اودا ورروستئی خبره يئی بيا بيا کوله .... اوزه ورته داسې حيرانه ناسته وومه لکه چې د چاچی ګونګی پيريان راغلی وی اوپه مانا ست وی...

(ګونګی پیریان ص114)

ترجمه :-

''ہاں۔میں لال رنگ دیکھوں تو مجھے خون یاد آجاتا ہے۔
''خون''!! میں مدھم آواز سے خود سے بولی اور سوچ میں پڑ گئی۔مگر دل مضبوط کر کے پوچھ بیٹھی۔
''خون؟؟''
''ہاں۔خون۔لال لال خون کے لوتھڑے۔لال سرخ خون۔'' وہ بولیں۔
''مگر خون آپ کو کس طرح یاد آجاتا ہے؟ چچی جان!! کیسا خون؟؟ کس کا خون ؟؟''
میں سارے سوال ایک ہی سانس میں پوچھ بیٹھی۔

''شفیق کا خون!!۔۔۔''

''آپ کے بیٹے کا خون؟؟''

''ہاں۔۔۔۔۔''

انہوں نے سسک کر ہنا نا شروع کیا جیسے وہ اسی کی منتظر تھیں مگر نظریں کہیں دور ہواؤں میں بھٹکی ہوئی تھیں جیسے خلاؤں میں کسی گمشدہ چیز کی تلاش ہو یا کچھ بھولے ہوئے واقعات یکجا کر رہی ہوں۔

''شفیق ایک روز گھر سے باہر بچوں سے الجھ پڑا۔ بات ہاتھا پائی تک پہنچ آئی۔ پاس پڑوس کی کچھ خواتین گلہ کرنے آئیں۔ میں ہنڈیا پکا رہی تھی۔ دھات کا بڑا چمچہ میرے ہاتھ میں تھا۔ وہ میں نے پیچھے سے دے مارا۔۔ وہ۔۔۔وہ ۔۔۔وہ تڑپ کے اوندھے منہ۔۔۔زمین پر گر پڑا۔ منہ سے خون کے لوتھڑے اگلنے لگا۔۔۔ سرخ لال خون۔۔۔۔تڑپ تڑپ کر۔۔۔ جان دے دی۔۔۔ میں نے اپنے۔۔۔اپنے شفیق بیٹے کو۔۔۔خود اپنے ہاتھ سے خون میں نہلایا۔۔۔اپنے ہاتھ۔۔۔اپنے ہاتھ۔۔۔اپنے۔۔۔۔''

یہ آخری بات بار بار دہراتی رہیں اور میں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ جیسے چچی کے گونگے جن آ کر مجھ سے چمٹ گئے ہوں۔

(گونگے جن ص 114)

''حنداره'' کی اشاعت کا واقعہ خاصا دلچسپ ہے۔ ہوا یوں کہ روایتی ماحول کی پابندیوں کے باعث اس سے پہلے بانو متفرق فرضی ناموں سے لکھتی رہیں جیسے ثریا بخاری، رضیہ بانو، شہناز خلیلہ، شگفتہ (ریتلی) وغیرہ۔ لیکن جب ''حنداره'' کتاب چھپی تو بانو نے ڈرتے ڈرتے والد سے کہا کہ خلیق صاحب سے میری کتاب کا معاوضہ لے آیئے بہر حال والد صاحب بصد حیرت گئے رائیلٹی کے فارم پر دستخط کئے اور معاوضہ وصول کئے بغیر واپس آ گئے۔ غصے سے بانو سے بولے ''تم باز نہیں آؤ گی؟؟''

تھوڑی دیر بعد ایک بچی ڈھائی سو روپے ''حنداره'' کا معاوضہ بانو کو دے گئی اور یوں بانو افسانہ نگار بن گئیں۔ اس بچی کا نام ''اختر'' تھا جو محترمہ بانو کے گھر قرآن شریف پڑھنے آتی تھی۔ بانو نے اسی بچی

کے ہاتھ "ھنداره" کا مسودہ بھجوایا تھا اور خلیق صاحب کو اتنا پسند آیا کہ چھاپنے کے لئے تیار ہو گئے۔ جانے کیوں 1955ء میں بھیجا گیا مسودہ 1958ء میں کتابی صورت میں چھپ سکا۔

"مات بنگڑی" (کانچ کے ٹکڑے) زیتون بانو کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ جو 1958ء ہی میں چھپنے کے لئے تیار تھا یہ بھی چھپائی کے مراحل سے گزر کر 1959ء میں پڑھنے والوں کے ہاتھ میں پہنچا۔ اسے بھی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اسے اتنی پذیرائی ملی کہ ایم۔اے پشتو سلیبس کا حصہ بنی۔ اس کے کچھ بعد دیگرے دو ایڈیشن چھپے ہیں۔

"مات بنگڑی" افسانوی مجموعہ کافی برسوں ایم۔اے پشتو کورس میں شامل رہا۔ افسانے کے حوالے سے "مات بنگڑی" کی کئی کہانیوں اور ان کے کرداروں کے بارے میں مختلف نوعیت کے سوالات امتحانی پرچوں میں نظر آتے ہیں۔ مصنفہ یعنی زیتون بانو اور ان کے ادبی کام اور مقام کے تعین پر بھی پوچھے گئے سوالات ملتے ہیں اس سے پشتو ادب میں افسانے کی اہمیت اور بانو کے افسانے کی قیمت اجاگر ہوتی ہے۔

"مات بنگڑی" کے بعد محترمہ زیتون بانو کی ایک اور افسانوی کاوش "ژوندی غمونہ" (زندہ دکھ) کو ایم۔اے کے پشتو کورس میں رکھا گیا ہے۔ ژوندی غمونہ کے اب تک تین ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

محترمہ بانو پر اور بانو کے ادبی کام پر، خاص کر افسانہ پر کچھ لڑکے لڑکیاں ریسرچ پیپرز بھی تیار کر رہے ہیں اور کچھ کر چکے ہیں۔

زیتون بانو صاحبہ کے افسانوی مجموعے "مات بنگڑی" میں بارہ افسانے شامل ہیں۔ ترتیب کچھ ایسی ہے۔

1۔	بخت	(نصیب)	افسانہ
2۔	نتکئی	(نتھ)	افسانہ
3۔	نشانئی		افسانہ
4۔	مات لاس	(ٹوٹا ہوا ہاتھ)	افسانہ
5۔	بیوزے	(ہاتھ کا پنکھا)	افسانہ
6۔	انتقام		افسانہ
7۔	اغه دغه	(اول فول)	افسانہ
8۔	صالئي	(صوالئے)	افسانہ
9۔	پولنگ ستمیتن		افسانہ

10- مات ہنگری (کانچ کے ٹکڑے) افسانہ

11- وهم افسانه

12- ډالئی (تحفہ) افسانه

اس افسانوی مجموعے "مات بنگړی" سے ایک اقتباس بمعہ اردو ترجمے ملاحظہ ہو۔

قیئو د خپل بدن نه غوښې شو کهدلې شان محسوس کړي. په وهلوخوړ لوکنبې دبدن په سوی اودړدونو کنبې هغې زر دشیرک لاس ته اوکتل... په انغرو پورې دهور بلولوغټې ببوزے ئې لاس کنبی وو . د ببوزی لیدو سره دقیئو نه خپل ځان هیرشو اولړه شیبه وړاندې دحجرې، ههره خبره او واقعه یئې په غوړونو کنبې رانږ ته

پام کوه جانانه ! چی لاس رانه وړے دګل نازک بدن مې ترمې ترمې ځینه دراځئی د سندرې هر تکے دهغې په زخمی بدن لکه دمرچکی لګیدو ... هغې اوس دخپل نیاز بین خوئے امین خان چغې سورې هم نه اثو رېدې او نه یئی څه لیدل ... دقیئو په سترګو تیاره شوه او هغې په خیال کنبې دوه ببوزی اولیده .. یو د طاوس د بڼو جوړ سپک او نازک ببوزے چې دشیرک لاس کنبې وو او په مزه مزه ئی په حجره کنبې راځتئی د مې ته وهلو اوبل دهور بلولو دروند ببوزے چې لړه شیبه اګاهو شیرک په قیئو په وهلو و هلو مات کړے وو .... او .... اوس د هغې خوا کنبی توتې تو تې پروت وو

(افسانہ "بیوزے" ص74، مات بنگڑی)

ترجمہ:

''قیشو نے محسوس کیا جیسے اس کے جسم سے گوشت نوچا جا رہا ہو۔ مار کھاتے کھاتے جسم کے گوشت کی جلن اور دردوں کے درمیان اس نے جلدی سے شیرک کے ہاتھ کو دیکھا۔ چولہوں کے پاس آگ کو ہوا دینے والا بڑا پنکھا اس کے ہاتھ میں تھا۔ پنکھا دیکھتے ہی قیشو اپنی مار بھول گئی۔ تھوڑی دیر پہلے کا گزرا حجرے کا ہر واقعہ اور ہر بات اس کی آنکھوں میں ناچنے لگی۔ اور اس کے ساتھ ہی راحتیء کے گانے کی آواز اس کے کانوں میں زہر گھولنے گھس آئی''۔

اے محبوب! خیال رکھنا! مجھے ہاتھ مت لگانا!!
کہیں میرا پھول سے نازک یہ جسم بکھر نہ جائے

راحتی طوائف کے گانے کا ہر لفظ اس کے زخمی جسم پر مرچوں کی طرح لگ رہا تھا۔ اپنے لاڈلے بیٹے امین خان کی چیخیں بھی اسے سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ اور نہ ہی اسے کچھ نظر آ رہا تھا۔ قیشو کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور اس نے تصور میں دو پنکھے دیکھے ایک مور کے پروں کا نازک ہلکا پنکھا جو شیرک کے ہاتھ میں تھا اور حجرے میں ناچتی راحتی کو ہولے ہولے جھل رہا تھا اور دوسرا آگ جلانے کا بھاری اور سخت پنکھا، جو کچھ ہی دیر پہلے شیرک نے اپنی بیوی قیشو کو مارتے مارتے توڑا تھا۔۔۔ اور۔۔۔ اب اس کے پہلو میں ٹکڑے ٹکڑے پڑا تھا۔

''بوزے'' ص74، (مات بنگڑی)

''یک مشت از خروارے''

بانو صاحبہ کی پہلی کوشش ''ھندارہ'' اور دوسری جرأت ''مات بنگڑی'' سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ میرمن زیتون بانو نے ادب کے میدان میں کچھ کر گزرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اور وہ اس میں کافی حد تک سرخرو بھی رہیں۔

محترمہ بانو کی ادبی خدمات

معروف انگریز ادیب اور نقاد میتھیو آرنلڈ کا کہنا ہے ''ادب تنقید حیات ہے، تفسیر حیات ہے، تعبیر حیات ہے'' یعنی ہر وہ شخص جسے ادیب یا شاعر ہونے کے ناطے معاشرے کے نباض ہونے کا دعویٰ ہے، اس کا فرض ہے کہ حیات انسانی کے گوں نا گوں حالات وواقعات کی عکاسی کرے۔ معاشرے کا عکس پیش کرے ۔اس عکس کو خوبصورت بنانے کی سعی کرے۔ گویا دوسرے لفظوں میں ''زندگی'' کی خدمت کرے۔

اس پیمانے سے ماپا جائے تو جس ادیب کی خدمت انسانی معاشرے کے لئے جتنی زیادہ ہوگی (خواہ طویل نہ ہو) وہ اتنا بڑا ادیب ہوگا۔ اگر میرمن زیتون بانو کی ادبی خدمات کا تجزیہ اس تناظر میں کیا جائے تو بلاشبہ وہ ایک قدآور ادیبہ ہیں جنہوں نے پشتون معاشرے اور روایات بالخصوص پشتون عورت کو دنیائے ادب سے متعارف کرایا۔ مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ بانو صرف عورت کے لئے لکھتی رہیں۔ نہیں۔ بلکہ پشتون مرد کی نمائندگی کا حق بھی آپ نے کماحقہٗ ادا کیا ہے۔

پروفیسر افضل رضا (مرحوم) پشتو ادب کے میدان میں ایک بڑا نام ہے۔ شاعر، ادیب اور ایک انتھک محقق کی حیثیت سے انہوں نے زندگی بتائی تھی۔ وہ اپنی کتاب ''پنځه شمعې'' (پانچ شمعیں) میں بانو کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''زیتون بانو نے جہاں پشتو افسانے میں معیار کا خیال رکھا ہے وہاں افسانوں کی مقدار اور گنتی کے لحاظ سے بھی پشتو افسانہ نگاروں میں اپنے لئے ایک نمایاں اور مضبوط مقام پیدا کیا ہے۔ غالباً پشتو میں ابھی تک کسی بھی افسانہ نگار کے 80 افسانے نہیں چھپے ہیں۔ اتنی تعداد کے ساتھ ساتھ فکری اور فنی لحاظ سے افسانے کے معیار پر توجہ دینا اور اس کا خیال رکھنا بانو ہی کا کارنامہ ہے''

افضل رضا ''پنجه شمې'' صفحہ 260

نوٹ: واضح رہے کہ محترمہ بانو کے مطابق ان کے قلم نے اب تک 97 افسانے اگلے ہیں۔ پشتو

افسانے کے میدان میں بانو نے ترقی کی جو منازل طے کی ہیں وہ ان کے روشن اور تازہ فکر اور ساتھ ادبی صلاحیتوں کی عکاس ہیں۔

رسمی طور پر اگر ان کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا جائے تو زیتون بانو کی سب سے بڑی انفرادیت یہ ہے کہ آپ سرحد کی ''پہلی صاحب کتاب خاتون'' ہیں۔ جو پشتو افسانہ نگار ہونے کا تاج سر پر رکھتی ہیں۔ اور یہ کوئی کم اہم بات نہیں کہ پشتون جیسے روایتی معاشرے میں ایک عورت ہونے کے باوجود نہ صرف لکھ جائے بلکہ شائع کرانے کی جرأت بھی کی جائے جبکہ لکھنے کا انداز بھی باغیانہ ہو۔ یہاں یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ یہ بغاوت معاشرے سے نہیں بلکہ معاشرے کی ان روایات سے ہے جو حیات انسانی سے جونک کی طرح چمٹ کر اس کا خون چوس رہی ہیں۔

بہر کیف زیتون بانو صاحبہ کی ادبی خدمات ہمہ جہت نوعیت کی ہیں۔

اپنی پہلی تحریر ''ھکرنی'' (کنڑی) جو مردان سے تین زبانوں اردو، پشتو اور انگریزی میں بیک وقت چھپنے والے رسالے ''قند'' میں قمر راہی صاحب کی ادارت میں چھپا تھا۔ اور راہی صاحب نے اس پر اپنا ادارتی نوٹ بھی دیا تھا کہ:

''زیتون بانو کا قلم کراما کاتبین کا سا بے رو و ریا اور نوکیلا ہے''۔ یہی افسانہ بعد میں ''انتقام'' کے نام سے ان کی کتاب ''مات بنگڑی'' میں شائع ہوا۔ اس پہلے افسانے سے ہی یہ ثابت ہو گیا تھا کہ ان میں افسانہ نگاری کی صلاحیت موجود ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ مزید نکھرتی رہی۔

افسانہ نگاری کے علاوہ بانو صاحبہ نے دوسری اصناف ادب پر بھی کام کیا ہے۔ ذیل میں ان کی متفرق ادبی حیثیات کا مختصر جائزہ لیا جا رہا ہے۔

افسانہ نگاری:

پشتو اور اردو افسانے سے دلچسپی رکھنے والا قاری زیتون بانو کو ایک نڈر افسانہ نگار کی حیثیت سے تو یقیناً جانتا ہے مگر بہت کم لوگ اس امر سے واقف ہیں کہ ضلع پشاور کے ایک گاؤں ''سپینہ وڑی ء'' (سفید ڈھیری) کی یہ لڑکی سکول کالج سے ہوتی ہوئی افسانہ نگاری کے میدان تک کس طرح پہنچی۔ یقیناً اس طویل مسافت کو طے کرنے میں اس کی ذہانت خود اعتمادی اور کچھ کر گزرنے کا شوق اس کا ہم سفر بھی رہا اور زادِ راہ بھی۔

محترمہ نے چھوٹی عمر ہی سے لکھنے کا آغاز کر دیا تھا۔ان کی تحریریں مقامی رسائیل اور اخبارات کی زینت بنتی رہتی تھیں کیونکہ لکھنے لکھانے کی صلاحیت انہیں ورثے میں ملی تھی۔ان کے خاندان میں کئی نامور لکھاری موجود تھے۔چنانچہ باَنو نے خاندانی وراثت میں سے اپنا حصہ ضرور پایا۔

ابتداء میں ان کے والد لکھنے سے انہیں روکتے رہے جس کے باعث وہ عرصے تک اپنا اصلی نام استعمال نہ کرسکیں اور ثریا بخاری، شھناز خلیہ، رضیہ باَنو اور شگلنہ (ریتلی) جیسے فرضی ناموں سے لکھتی رہیں۔

باَنو کے ان فرضی ناموں کی دیکھا دیکھی ''لار'' (راستہ)، ژوند (زندگی) ''حپلواک'' (خودمختار)، ''منگیالے'' (غیرتی) جیسے پشتو کے اس زمانے کے چھپنے والے رسالوں میں کچھ اور ادیباؤں اور شاعرات کے نام بھی نظر آنے لگے تھے جیسے پروین بخاری، ممتاز خلیلہ، ذکیہ بانو اور مہینہ (نازک) وغیرہ۔لیکن ایک آدھ غزل ایک دو خطوط کے علاوہ ان فرضی خواتین لکھاریوں کی کوئی اور تحریر آگے نہ چھپ سکی۔باَنو نے متاسفانہ بتایا۔

''ادبی منظر نامے سے ان خواتین کا یوں غائب ہوجانا مجھے بڑا دکھی کرگیا کہ میں اس میدان میں پھر سے تنہا رہ گئی تھی''۔

میرمن (محترمہ) زیتون باَنو کے افسانوں کا پہلا پشتو افسانوی مجموعہ ''ھندارہ'' کے نام سے 1958ء میں منظر عام پر آیا حالانکہ جب آپ دسویں جماعت میں تھیں یعنی 1955ء میں۔تو ''ھندارہ'' خلیق صاحب کو چھپوانے کے لئے بھیجا گیا تھا اور آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ پشتو شاعری میں ان کی ہمسری کا دعویٰ کوئی خاتون تو کرسکتی ہے مگر نثر میں ان کی ہم پلہ خاتون لکھاری شاید ہی کوئی ہو۔

ویسے محترمہ باَنو ادب میں مرد عورت کی تخصیص سے منکر ہیں۔''ھندارہ'' (آئینہ) کے جلد ہی بعد دوسری کتاب ''مات بنگڑی'' (کانچ کے ٹکڑے) چھپی۔یہ بھی 1959ء میں شائع ہوئی تھی۔بعد ازآں ''ژوندی غمونہ'' (زندہ دکھ) اور ''خوبونہ'' (خواب) کے ناموں سے چھپیں پشتو افسانوں کے ان چار مجموعوں نے یہ بات پایہء ثبوت تک پہنچائی کہ افسانہ نگاری واقعی زیتون باَنو صاحبہ کے لئے ایک مشن کا درجہ رکھتی ہے۔

پشتو افسانوں کے ان مجموعوں کے علاوہ ''شیشم کا پتا''۔''وقت کی دہلیز پر'' اور ''زندہ دکھ'' اردو افسانوں کے مجموعے شائع ہوکر ارباب ادب سے داد و تحسین وصول کر چکے ہیں۔اردو کے ان افسانوں میں کئی افسانے طبع زاد بھی ہیں۔اس ضمن میں باَنو سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تاج نے باَنو کے ایک اور اردو افسانوی مجموعے ''برگد کا سایہ'' کا مسودہ لاہور میں کسی ناشر کے حوالے کیا تھا۔کافی عرصہ بعد معلوم ہوا کہ

کتاب چھپنے کے مراحل سے گزر کر بس منظر عام پر آیا ہی چاہتی ہے۔ کچھ دن خاموشی رہی پھر پتہ چلا کہ وہ لوگ نشر و اشاعت کا کاروبار بند کر کے کوئی اور دھندہ کرنے لگے ہیں اور کتاب بمعہ مسودے لاپتہ ہو چکی ہے۔ یہ بات زیتون بانو صاحبہ کو ڈاکٹر سلیم اختر صاحب سے معلوم ہوئی۔

''برگد کا سایہ'' کے سارے ہی افسانے اردو کے طبع زاد افسانے تھے۔ اس دوران تاج سعید صاحب رحلت فرما گئے اور بانو صاحبہ نے چُپ سادھ لی۔

بطور افسانہ نگار کے بانو کی خاصیت یہ ہے کہ انہوں نے کہانی خو سے گھڑی نہیں بلکہ یہ سب حقیقی کہانیاں ہیں کیونکہ خود بانو کے مطابق ایک حقیقی کہانی کار کے لئے ہر قدم اور ہر گام پر افسانے بکھرے پڑے ہیں۔ اگر ذہن رسا ہو اور نگاہ دوربین، تو زندگی کے ہر واقعے کو افسانہ بنایا جا سکتا ہے ایک ایسا افسانہ جو قاری کو اپنی گرفت میں لے سکتا ہے۔

ان کے افسانوں کے موضوعات گھریلو معاملات، خاندانی جھگڑوں دیور، نند، ساس، سسر، بھائی، بھاوج، چچا چچی، ماموں ممانی اور پھوپھی وغیرہ کے حسد و رقابت، حق تلفیوں، معاشرتی ظلم و استبداد کی تصویریں ہیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ گھریلو مسائل سے باہر نکلتی ہی نہیں، بلکہ ایک با شعور اور حساس انسان ہونے کے ناطے ان کے ہاں دفاتر میں کام کرنے والی لڑکیاں، ہسپتالوں میں مریضوں کی خدمت کرنے والی نرسیں، سازشی اہلکار، شفیق القلب اور نیک دل ڈاکٹر، محبت، نفرت، سرفروش سپاہی۔

گودر (پنگھٹ) پر ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑوں سے خواب سجانے والے جوان، بدعنوان اور بد خصلت افسر، اور حجروں کی محفلیں سجانے والے سبھی طرح کے لوگ شامل ہیں۔

بقول مشتاق یاد۔

> ''ان کے افسانوں میں پھول اور کانٹے، خوشبو اور بدبو، نیکی بدی باہم دست و گریباں ہیں۔ اس کے ذریعے ہم پشتو افسانوں کے مزاج فکر، سوچ اور لہجے سے آگاہ ہوتے ہیں اور ہمیں پشتون علاقے کی تمدنی اور تہذیبی زندگی کی سچی تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ 2

جب بانو صاحبہ کے پشتو افسانوں کے اردو تراجم کی پذیرائی ہوئی تو ان کا حوصلہ بڑھا اور انہوں نے اردو میں باقاعدہ لکھنا شروع کیا۔ بانو نے پہلا اردو افسانہ ''سوغات'' لکھا جو ریڈیو پاکستان کے رسالے

آہنگ'' میں شائع ہوا۔ اردو کے ساتھ ساتھ پشتو کا سلسلہ بھی چلتا رہا ہے۔ اردو طبع زاد افسانوں کا
وعہ ''برگد کا سایہ'' تیار تھا۔ لاہور کے کسی ناشر کو چھاپنے کے لئے تاج سعید نے دیا تھا مگر ان کی رحلت
مانے سے بات آئی گئی ہوگئی اور ''برگد کا سایہ'' کی قسمت کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ بد قسمتی سے بانو کے پاس
ودے کی دوسری کاپی بھی موجود نہیں تھی۔ ادھر اُدھر سے دو چار افسانے ہاتھ لگے جو ''نیزہ وڑے''
یلابی تنکے) کتاب میں پشتو میں چھپ گئے۔

تازہ ترین مجموعے ''نیزہ وڑے'' کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ بانو صاحبہ کے
م نے اب نانی اور دادی کی عمر پانے کے باوجود ایسے موضوعات کو چھیڑا ہے جو ان کی نوجوانی کے
ار سے متعلق ہیں۔ وہی تازگی، وہی طراری اب بھی قائم و دائم ہے۔ البتہ عالمگیریت کے رنگ
یدنکھر گئے ہیں۔

''جناب رضا ہمدانی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ''وقت اپنا چولا بدلتا رہتا ہے۔۔اور پھر وقت نے اپنا چولا بدلا تو وہ زیتون بانو کے روپ میں ہمارے سامنے آیا۔ ایک جیالی فنکار کے روپ میں پریم چند اور راحت زاخیلی کے پُر جنم کے روپ میں۔ مگر ایک تازہ دم، جدید فکر اور جوان احساس کے ساتھ۔ ایک ہاتھ میں شاخ زیتون ہے دوسرے میں نوک نشتر۔ یہی سامان اس کا اثاثہ فن ہے۔ وہ امن کی پرچارک بھی ہے اور دفاع کا ہنر بھی جانتی ہے۔ یہی ہنر اور سلیقہ اس شاخ زیتون کے تحفظ کے لیے اسے سینہ سپر کر دیتا ہے۔ وہ زیتون کی نازک ٹہنی کی محافظ بن کر فی سبیل اللہ اس کی وکالت کرتی ہے۔ اس کے تمام افسانے اس ایک نظریئے کے گرد گھومتے ہیں۔ وہ مرد کے ساتھ عورت کے جینے کا مساوی حق مانگتی ہے۔ وہ عورت کو بھی اسی طرح احسن تقویم سمجھتی ہے جس طرح مرد کو۔ مظلوم کے ساتھ اس کے قلم کا جذباتی رشتہ ہے۔ اگر یہ 'مظلوم' عورت ہو تو پھر اس کا قلم آتش زبان بن جاتا ہے۔ بانو وقت کی ستم آرائی سے بے خبر نہیں۔ وہ وقت کی دہلیز پر ایک آبز رور کی طرح ایستادہ ہو کر اپنے گرد و پیش کی سفا کیوں کا مشاہدہ کرتی ہے۔ یہی مشاہدہ اس کے فن کو مواد خوراک مہیا کرتی ہے اور پھر وہ ان حقائق کو بے کم و کاست بیان کر

''آہنگ'' میں شائع ہوا۔ اردو کے ساتھ ساتھ پشتو کا سلسلہ بھی چلتا رہا ہے۔ اردو طبع زاد افسانوں کا مجموعہ ''برگد کا سایہ'' تیار تھا۔ لاہور کے کسی ناشر کو چھاپنے کے لئے تاج سعید نے دیا تھا مگر ان کی رحلت فرمانے سے بات آئی گئی ہوگئی اور ''برگد کا سایہ'' کی قسمت کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ بدقسمتی سے بانو کے پاس مسودے کی دوسری کاپی بھی موجود نہیں تھی۔ ادھر اُدھر سے دو چار افسانے ہاتھ لگے جو ''نیزہ وڑے'' (سیلابی تنکے) کتاب میں پشتو میں چھپ گئے۔

تازہ ترین مجموعے ''نیزہ وڑے'' کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ بانو صاحبہ کے قلم نے اب نانی اور دادی کی عمر پانے کے باوجود ایسے موضوعات کو چھیڑا ہے جو ان کی نوجوانی کے ادوار سے متعلق ہیں۔ وہی تازگی، وہی طراری اب بھی قائم و دائم ہے۔ البتہ عالمگیریت کے رنگ مزید نکھر گئے ہیں۔

> ''جناب رضا ہمدانی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ''وقت اپنا چولا بدلتا رہتا ہے۔۔ اور پھر وقت نے اپنا چولا بدلا تو وہ زیتون بانو کے روپ میں ہمارے سامنے آیا۔ ایک جیالی قلمکار کے روپ میں پریم چند اور راحت زاخیلی کے پُر جنم کے روپ میں۔ مگر ایک تازہ دم، جدید فکر اور جوان احساس کے ساتھ۔ ایک ہاتھ میں شاخ زیتون ہے دوسرے میں نوک نشتر۔ یہی سامان اس کا اثاثہ فن ہے۔ وہ امن کی پرچارک بھی ہے اور دفاع کا ہنر بھی جانتی ہے۔ یہی ہنر اور سلیقہ اس شاخ زیتون کے تحفظ کے لیے اسے سینہ سپر کر دیتا ہے۔ وہ زیتون کی نازک ٹہنی کی محافظ بن کر فی سبیل اللہ اس کی وکالت کرتی ہے۔ اس کے تمام افسانے اس ایک نظریئے کے گرد گھومتے ہیں۔ وہ مرد کے ساتھ عورت کے جینے کا مساوی حق مانگتی ہے۔ وہ عورت کو بھی اسی طرح احسن تقویم سمجھتی ہے جس طرح مرد کو۔ مظلوم کے ساتھ اس کے قلم کا جذباتی رشتہ ہے۔ اگر یہ 'مظلوم' عورت ہو تو پھر اس کا قلم آتش زبان بن جاتا ہے۔ بانو وقت کی ستم آرائی سے بے خبر نہیں۔ وہ وقت کی دہلیز پر ایک آبزرور کی طرح ایستادہ ہو کر اپنے گرد و پیش کی سفاکیوں کا مشاہدہ کرتی ہے۔ یہی مشاہدہ اس کے فن کو مواد خوراک مہیا کرتی ہے اور پھر وہ ان حقائق کو بے کم و کاست بیان کر

تنقیدی جائزہ

میز من بانوؔ کے فن کا

فکری تجزیہ اور خصوصیات

پلاٹ :

جس طرح ایک مضبوط بنیاد عمارت کے استحکام کی ضامن ہوتی ہے اور اس کے لئے لازمی جزو ہے یا
انی جسم میں ریڑھ کی ہڈی اہم ترین عضو ہے، بالکل اسی طرح افسانوی صنف ادب کے واسطے بھی
ٹ بے حد اہم چیز ہے۔ کوئی بھی ادیب اس کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا۔
دراصل پلاٹ کہانی کے تار و پود کی بنت کا نام ہے۔ ایک افسانہ نگار اپنے ارد گرد پھیلی زندگی یا اپنے
ںل کے زور پر افسانے کے لئے ایک واقعہ چنتا ہے اس واقعے کے د۔۔۔ کچھ ذیلی لوازمات کا سہارا لیتا
ہ اور ان کی مدد سے ایک کہانی تشکیل دیتا ہے ایسی کہانی جو ہمیں ایک تاثر فراہم کرتی ہے۔ اگر پلاٹ
ں کسی قسم کا جھول رہ جائے تو افسانہ ایک من گھڑت کہانی سے بڑھ کر یا کذب و جھوٹ سے زیادہ کچھ
وس نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ نگار واقعے اور کہانی کے تانے بانے بہت احتیاط اور فن کاری سے
اور ترتیب دیتا ہے تا کہ افسانہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکے اور وحدت تاثر کا بے مثال نمونہ ہو اور
ی کا وقت بھی ضائع نہ ہو۔
میز من زیتون بانوؔ بھی اپنے افسانوں میں اس بات کا خیال رکھتی ہیں اور پلاٹ پر پوری توجہ دیتی ہیں
ن کے کسی بھی افسانے کو پڑھ کر دیکھ لیں آپ کو کہیں بھی کسی قسم کا سقم یا جھول نظر نہیں آئے گا۔
ن کے افسانے کا ہر چھوٹا بڑا واقعہ ایک تسلسل کی صورت میں سامنے آتا ہے اور مرکزی واقعے کی طرف

مرتکز ہوتا جاتا ہے۔ افسانہ چاہے پشتو کا ہو یا اردو کا، اس میں منطقی رابطہ پایا جاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ خاصیت ان کے پہلے افسانے میں بھی موجود ہے جس کی بنا پر یہ مصنفہ کی پہلی یا غیر پختہ کاوش محسوس ہی نہیں ہوتی اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ ان کی افسانہ نگاری کی یہ خوبی مزید نکھرتی رہی ہے۔

اس سلسلے میں بے شمار افسانوں کی مثال دی جاسکتی ہے مثلاً ''ٹھگئی''۔ ''مات بگڑی''، ''شیشم کا پتا''، ''وقت کی دہلیز پر''، ''فصیلیں''، ''نشانی''، ''پہچان''، ''زندہ دکھ''، ''خود فریبی''، ''گونگے جن''، ''امانت'' وغیرہ۔ یہ سب اور ان کے علاوہ دیگر افسانوں میں بھی بانو نے افسانے کے فن کے اس تکنیکی پہلو کو مدنظر رکھا ہے۔

بانو کی فنی خصوصیت یہ ہے کہ جس طرح انسانی زندگی وقت کی رواں لہر کے ساتھ ایک تسلسل اپنا لیتی ہے بعینہٖ بانو کی کہانیاں بھی ایک مربوط صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ بانو نے ایک ناولٹ بھی لکھا۔ اس طرح پلاٹ کی یہ مضبوطی اور پختگی اس میں زیادہ خوبصورتی سے سامنے آئی ہے۔

اپنے ایک افسانے ''موم کے آنسو'' میں بانو نے فکر کے ساتھ ساتھ تکنیک اس خوبی سے استعمال کیا ہے کہ یہ افسانہ ادب کا ایک شہکار بن گیا ہے۔ یہ کہانی اس کائناتی حقیقت سے جڑی ہوئی ہے کہ وقت ہر چیز پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وقت کے ساتھ ساتھ انسان اپنے پیاروں کی دائمی جدائی بھی قبول کر لیتا ہے اور زندگی کی دیگر مصروفیتوں اور ہماہمی میں ایسا گم ہو جاتا ہے کہ ماتم کرنے کا بھی موقع نہیں مل پاتا اگرچہ غم اور دکھ اپنی جگہ بدستور موجود رہتے ہیں۔ اس پورے نظریئے کو بانو نے ایسے تاروپود میں پرویا ہے کہ قاری بے اختیار ان کی بات پر ایمان لے آتا ہے اور سوچتا ہے کہ یہ تو ہمارے احساس کی بات ہو رہی ہے اس خوبی کا ہی اثر تھا کہ جناب جلیل حشمی مرحوم نے اس افسانے کو پڑھنے کے بعد ایک خط میں بانو صاحبہ کو لکھا:

''اگر آپ اس افسانے کے بعد افسانہ نگاری ترک کر دیں تو صرف یہ ایک افسانہ بھی آپ کو ادبی دنیا میں زندہ رکھے گا۔''

اصل بات یہ ہے کہ بانو نے اپنی کم عمری ہی سے مطالعہ کی عادت اپنالی تھی۔ انہوں نے سکول کے زمانے میں ہی منٹو، پریم چند، اور دیگر بڑے افسانہ نگاروں کو پڑھنا شروع کیا۔ چنانچہ جب انہوں نے لکھنا شروع کیا تو وہ فن افسانہ نگاری کے رموز اور روایت سے باخبر تھیں اور اس روایت کو انہوں نے اپنی تحریروں میں ہمیشہ کامیابی کے ساتھ برتا۔

زیتون بانو دعویٰ تو نہیں کرتیں مگر جو کہتی ہیں سچ ہی کہتی ہونگی۔۔۔''میں نے اپنی تحریروں میں کبھی بھی کسی سے اصلاح نہیں لی''۔

چونکہ افسانہ ہیئت کے اعتبار سے مختصر صنف ادب ہے اور یہ ایک مشکل کام بھی ہے۔ناول اور داستان میں مصنف کو چھوٹ بھی مل جایا کرتی ہے اگر اس نے واقعات میں کوئی بھول چوک یا کمی بیشی کر بھی لی ہو۔مگر افسانہ یہ بوجھ برداشت نہیں کرتا۔افسانے کا اختصار اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ پوری چابکدستی ، ورمہارت کا مظاہرہ کیا جائے۔گویا بقول شخصے۔

''اہم وہ نہیں ہوتا جو ہم کہتے ہیں۔اہم وہ ہوتا ہے جو ہم نہیں کہتے''افسانہ دراصل اسی کہنے اور نہ کہنے کی کہانی ہے۔افسانہ نگار سب کچھ خود نہیں کہتا بلکہ کچھ قاری کے لئے بھی چھوڑ دیتا ہے اور پھر یہ قاری کی صوابدید پر ہوتا ہے کہ وہ اپنے تخیل کا استعمال کس طرح اور کس حد تک کرتا ہے۔یہی کہنا،نہ کہنا،کب؟کس طرح کہنا ہے جو پلاٹ کی تکنیک میں بے حد ضروری ہے۔

بہر کیف،یہ ایک حقیقت ہے کہ بانو کے افسانوں میں ایک پختگی،برجستگی،توازن اور ربط موجود ہے جس کی وجہ سے قاری ان کی تحریر سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکتا ہے۔اس حوالے سے احمد پراچہ لکھتے ہیں۔

''ان کے افسانوں کے پلاٹ تیزی سے آگے بڑھتے ہیں اور قاری کے تجسس میں اضافہ کرتے ہیں۔''

موضوعات :

محترمہ زیتون بانو نے اپنے افسانوں کے لئے موضوعات بھی پختون معاشرے سے چنے اور سرحد کے پختون علاقے کی سماجی اور معاشرتی زندگی کی عکاسی کی۔بانو نے اس معاشرے کی چھوٹی بڑی ہر روایت اور ہر رخ کا گہرا مشاہدہ اور وسیع مطالعہ کیا اور پھر بڑی جرأت اور بے خوفی سے اس کی برائیوں پر قلم اٹھایا۔بانو نے سسکتی ہوئی انسانیت کو ظلم اور جبر کے پنجے سے چھڑانے کے لئے جس طرح اپنی کہانیوں کے ذریعے جہاد کیا۔وہ ان کے موضوعات کو ایک واضح انفرادیت بخشتا ہے۔

انہوں نے انسانی معاشرے کے باسیوں،اس معاشرے کی رسموں رواجوں،اس کی خوبیوں اور اس کی خامیوں کو اپنے افسانوں میں موضوعات کے طور پر استعمال کیا اور خوب استعمال کیا۔اہم بات یہ ہے کہ ان موضوعات کی پیشکش میں کہیں بھی تفصیلات اور بے جا طوالت سے کام نہیں لیا بلکہ ہمیشہ موضوع کو

موزوں الفاظ میں سمیٹنے کی کوشش کی مگر تحریر میں کوئی سقم آنے نہیں دیا۔

انہوں نے سماجی ناانصافیوں، معاشرتی المیوں، غلط روایات اور علاقائی جبر واستحصال کی نہایت جاندار عکاسی کی۔اس سلسلے میں خود بانو کا کہنا ہے۔''میرے افسانوں میں آپ کو خوشبو بہت کم محسوس ہوگی کیونکہ میں رستے ناسور قلم کے ذریعے پھوڑتی ہوں اور کچے پکے ناسوروں میں بدبو ہی ہوا کرتی ہے''۔میرمن بانو کی اس خاصیت کو اکثر نقاد سعادت حسن منٹو کے اثر سے تعبیر کرتے ہیں اور ان پر ایک طرح سے الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے منٹو سے متاثر ہوکر اپنے اس پسندیدہ افسانہ نگار کو دہرایا ہے یا پھر بانو کو سرحد کی عصمت چغتائی بھی کہا گیا۔مگر حقیقت یہ ہے کہ محترمہ بانو نے ایک حساس اور ذمہ دار فنکار ہونے کے ناطے وہی لکھا جو محسوس کیا اور اپنے اردگرد ہوتے دیکھا۔

جہاں تک منٹو سے متاثر ہونے کی بات ہے تو شاید اس کا سبب یہ ہو کہ بانو نے بھی جنس پر لکھا، بے دریغ لکھا، بے لاگ اور بغیر لیٹے لپٹائے لکھا۔حیران کن بات یہ ہے اور دوسری خواتین لکھاریوں کے لئے قابل فخر بھی اور قابل تقلید بھی کہ پختونوں کے قبائلی معاشرے میں جہاں مرد بھی ایسے حساس موضوعات پر لکھنے کی خود میں جرأت نہیں پاتے ہوں وہاں بانو نے انسانی شخصیت اور زندگی کے اس اہم گوشے پر روشنی ڈالی۔اس سلسلے میں خود بانو کا کہنا ہے۔

> ''کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اب جنس پر زیادہ لکھنے لگی ہوں۔۔۔میں جنس کو موضوع نہیں بناتی۔میں تو انسانی معاشرے اور اس میں رہنے والوں کی نفسیات پر لکھتی ہوں۔انسان جنس ہے۔مرد ہے یا پھر عورت ہے ان کے مسائل ہیں۔اب انسانی مسائل پر نہ لکھوں تو کیا کتے بلیوں کے مسائل پر لکھوں۔''

جنس کے موضوع پر محترمہ بانو کا شاہکار افسانہ ''شیشم کا پتا'' ہے۔یہ افسانہ ان کے افسانوں کے تراجم پر مبنی اردو مجموعے ''شیم کا پتا'' میں موجود ہے جو ابلاغ اور تیکھے پن میں اپنی مثال آپ ہے۔ جنسی تشنگی پر مبنی اس افسانے کا ترجمہ رحیم گل نے نہایت خوبصورتی سے کیا ہے۔اس افسانے کا ایک اقتباس حاضر ہے۔

> ''واقعی شمو بیچاری تھکی ہوئی تھی اور اوندھے منہ چارپائی پر پڑی تھی۔میں آگے بڑھی۔اس کے کندھے پر ہاتھ رکھنے ہی والی تھی کہ مجھے ہلکی سی ایک سسکی سنائی دی۔میں نے غور سے دیکھا۔حجرے سے واپس آئے ہوئے بستروں میں سے

"اس نے ایک تکیہ سینے کے ساتھ بھینچا ہوا تھا اور والہانہ انداز میں اس سے اپنا رخسار رگڑ رہی تھی۔ وہ بے حد سرشار تھی اور اس کے انداز میں بلا کی دیوانگی اور خستگی تھی۔ اور میں نے اپنے منہ میں شیشم کا کسیلا پتہ گھلتا ہوا محسوس کیا"

یہ ہے شمو جس نے اپنی فطری بھوک مٹانے کا ایک غیر فطری طریقہ ڈھونڈ نکالا ہے اس سے وقتی طور پر سے سکون مل جاتا ہے۔ ایک سخت گیر معاشرے میں ایک جوان لڑکی کی یہ کیفیت نہ ہو تو اور کیا ہو۔ بلاشبہ یہ ایک خوبصورت اور موثر افسانہ ہے اور گہری معنویت لئے ہوئے ہے۔

بانو صاحبہ کا ایک اور اہم موضوع پختون معاشرے میں انتقام کی اہمیت ہے۔ اس معاشرے میں محبتیں تو بھلائی جا سکتی ہیں۔ مگر دشمنی نسل در نسل چلتی رہتی ہے اور قتل کا بدلہ لینا غیرت کی علامت ہے۔ بانو کا افسانہ "زندہ دکھ" اس موضوع کا ایک کامیاب افسانہ ہے۔

"اگر چہ یہ ایک حقیقت ہے کہ بانو کے افسانوں کا کینوس اور موضوعات زیادہ وسیع نہیں مگر جس موضوع پر انہوں نے قلم اٹھایا۔ کامیابی سے ہمکنار کیا۔" موم کے آنسو" ایک ایسا ہی افسانہ ہے جس کے ذریعے مصنفہ نے ثابت کیا ہے کہ وقت زخم بھی لگاتا ہے مگر اس پر مرہم افشانی بھی کرتا ہے۔ جیسے ایک عورت جو بھائی کی موت پر ہوش و حواس کھو دیتی ہے کچھ برس گزرنے کے بعد اس کا زخم مندمل ہو جاتا ہے اور پھر ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب وہ عورت بھائی کی قبر پر جاتی ہے تو قبر کی جگہ بھول چکی ہوتی ہے بھائی کی قبر نہیں ملتی۔ بیٹی سے بڑے غیر جذباتی لہجے میں کہتی ہے" آؤ بیٹی!! بہت دیر ہوگئی۔"

اصل بات یہ ہے کہ میر من زیتون بانو معاشرے کی زندہ حقیقتوں کی افسانہ نگار ہیں۔ انسانی جذبات و کیفیات کی طرح ان کے افسانے بھی رنگا رنگ اور بوقلموں ہیں۔ انسانوں کی طرح بے شمار رنگ، تعداد جہتیں اور لامحدود عکس لئے ہوئے بانو نے جہاں اپنے علاقے کے عکس دکھائے ہیں وہاں اس تپش سے بھی متعارف کرایا ہے جو نئے عہد کی حرارت سے پرانے سماجی ڈھانچے کے پگھلنے سے پیدا ہوتی ہے اس سلسلے میں ایک انگریزی روزنامہ لکھتا ہے۔

ترجمہ:

"وہ اپنے دیہاتوں اور شہروں کے تناظر میں زندگی کے کھیل کو اپنے زاویہ نگاہ سے دیکھتی اور پیش کرتی ہیں۔"

(فرنٹیر پوسٹ پشاور)

جبکہ مرزا ادیب کا اس حوالے سے کہنا ہے۔

''ایک چھوٹے سے واقعے کے تناظر میں رہ کر انسانی زندگی کے گہرے حقائق پر تجزیاتی نظر ڈالنا کوئی کم فنی پختگی نہیں ہے۔ زیتون بانو ایک باشعور فنکار کی طرح ان معاشرتی زنجیروں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی سے کام نہیں لیتیں۔''

محترمہ بانو کے افسانوں کے موضوعات کے انتخاب کا ہی کمال ہے کہ وہ اپنے اردگرد پھیلی ہوئی معاشرتی زندگی سے چند دکھ، چند المیئے چن کر انہیں ایک سچے اور مخلص فنکار کی طرح سادہ مگر دلنشیں انداز میں پیش کر کے بار بار ہمارے دل و دماغ کو جھنجھوڑنے اور ہمارے ذہنوں میں نو کیلے سوالات پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

بانو وہ نڈر فنکارہ ہے جو بے خوفی اور جرأت کے ساتھ مسخ شدہ اخلاقیات کی بوسیدہ عمارتوں کو ڈھا کر سچائیوں کے نئے گھروندے بناتی ہیں۔ انہوں نے جہاں معاشرے کے ان گندے پھوڑوں کی بات کی ہے وہاں پشتون معاشرت کی خوبیوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ پختونوں کی عظمتِ احساس، ان کے ارفع اور بے ریا جذبے، ان کی مہمان نوازی اور دریا دلی، ان کی غیرت اور خودداری، روایات کی پاسداری، ان کے آدرش اور امنگیں، ان کی آرزوئیں اور خواہشات ان کی محبتیں اور چاہتیں، سب بانو کے موضوعات ہیں۔ اسی لئے ان کے افسانوں میں پختون معاشرہ اپنے سارے جزئیات کے ساتھ سانس لیتا نظر آتا ہے۔

ان کے افسانے چاہے وہ ''ھندارہ'' میں موجود ہوں یا ''مات بنگڑی'' کا حصہ ''ژوندی غمونہ'' کا کوئی افسانہ ہو۔ ''خوبونہ'' کی کوئی کہانی۔ ''شیشم کا پتا'' یا ''وقت کی دہلیز پر'' ہو۔ غرض ان کی کوئی تصنیف اٹھا کر دیکھ لیں آپ کو جذبے ہی نظر آئیں گے جو بظاہر پشتون معاشرے، اس کے رسم ورواج، اس میں موجود پابندیوں اور قیود وحدود سے جنم لیتے ہیں۔ لیکن اصل میں وہ انسان کے جذبے ہیں۔ بنیادی جذبے، جن میں ہر جذبہ شامل ہے۔ عشق، محبت، شفقت، غم وغصہ، رشک، حسد، نفرت، انتقام، جنس وغیرہ سب کچھ۔

بانو ہمیں بتاتی ہیں کہ

پشتون کون ہیں؟
کیا سوچتے ہیں؟
کیا محسوس کرتے ہیں؟
اس میں نفرت کیا معنی رکھتی ہے؟
انتقام کی روایت کی کیا حیثیت ہے؟
یہ کیسے دوست ہیں اور کیسے دشمن؟
یہ محبت کرتے ہیں تو کس حد تک؟

محترمہ باتو کے افسانوں کی خوبصورتی اور تاثیر کا اعتراف کرتے ہوئے محترمہ عذرا اصغر اپنی رائے ظاہر کرتی ہیں:

> ''زیتون بانو کے افسانوں میں معاشرے کی فرسودہ جکڑ بندیاں قدامت پسند اور قدامت پرست تہذیب کی پابندیاں، خاندانی رسومات کی بیجار کاوٹیں۔ غلامی اور آزادی کی صلیب پر لٹکتے بے بضاعت انسانوں کی کاوشیں۔ پڑھنے والوں کو جھنجھوڑتی ہیں۔ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ کب انسان، انسان کی قید سے آزاد ہوگا؟ کب کہنہ روایات کی زنجیریں کٹیں گی؟ اور کب انسان کو اس کا پیدائشی حق ملے گا؟'' بہر کیف! موضوعات کے اعتبار سے باتو کے افسانے ہمیں بتاتے ہیں کہ پختونوں کے معاشرے میں تبدیلی واقع ہو رہی ہے دقیانوسی اور فرسودہ رسمیں آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہیں۔ زمانہ کروٹ لے رہا ہے اور اس کروٹ میں اہم حصہ محترمہ زیتون بانو کی افسانہ نگاری کا بھی ہے''۔

کردار نگاری:

زیتون بانو صاحبہ کے زیادہ تر کردار چاہے وہ افسانے کے ہوں، ڈرامے کے یا ناول کے کردار ہوں، اپنے ہی ماحول کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ وہ اپنے گرد و پیش میں عام لوگوں کو دیکھتی بھالتی ہیں ان کا مشاہدہ کرتی ہیں اور پھر ان سچے کرداروں کو اپنے افسانوں کا حصہ بناتی ہیں۔ اس بارے میں خود بانو کا اپنا کہنا ہے۔

''میرے افسانوں کے سب کردار خود بولتے ہیں کہ یہ حقیقی ہیں اور قاری اس کی تائید کرتا ہے کہ یہ کردار ہمارے معاشرے کے جیتے جاگتے کردار ہیں۔''

یہ کردار چاہے پشتو طبع زاد افسانوں کے ہوں یا اردو تراجم کے، سانس لیتے جیتے جاگتے، روتے ہنستے، بولتے چالتے، محبت اور نفرت، غصہ اور حسد کرتے عام زندہ انسان کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ ایسے انسان جنہیں ہمہ وقت زندگی سے بھرپور کشمکش سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ چاہے ''شیشم کا پتا'' کی شمو ہو، یا ''جیت'' کا زرگل یا پھر ''موم کے آنسو'' کی دکھی اور بے بس بہن۔ ہم جیسے انسان ہیں۔ عام اور سچے انسان وقت اور حالات اور قسمت اور ظلم و جبر سے لڑتے، گاہے مایوس اور گاہے پُر امید ہوتے لوگ۔

میر من بانو کے ہاں ہمیں زیادہ تر ایسے کردار ملتے ہیں جو حالات کا بڑی جوانمردی سے مقابلہ کرتے ہیں۔ اور کسی بھی مرحلے پر شکست تسلیم نہیں کرتے۔ بانو کا ہر کردار اپنی انفرادی شخصیت رکھتا ہے اسی سبب ہم انہیں بہت آسانی سے پہچان لیتے ہیں۔ یہ ہمارے اپنے ہیں، ہمارے عزیز و اقارب ہیں اور ہم خود ہیں۔ ہمارے ہی طرح گوشت پوست کے بنے انسان سیلور، حلیم، قیشو، مارد، ظریف، شمو، مہتابہ۔ اسی لئے تو ہم ان کی کمزوریوں، خوبیوں اور خامیوں سے واقف ہیں پوری طرح آگاہ۔

محترمہ بانو کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہمیں ان کرداروں کی پوشیدہ نفسیاتی الجھنوں سے آگاہ کرتی ہیں۔ ان کا ہر کردار ایک زندہ حقیقت ہے۔ خواہ تلخ ہی کیوں نہ ہو۔ مثلاً ''شیشم کا پتا'' کی شمو۔ یہ کردار اپنے اندر گہری معنویت رکھے ہوئے ہے۔ ایک روایتی اور سخت گیر معاشرے میں بسنے والی ایک جوان لڑکی کی نفسیاتی تحلیل کا بلیغ اشارہ کرتا ہے ایک ایسی لڑکی جو اپنی نا تمام جنسی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے حجرے سے استعمال ہو کر آنے والے جھوٹے کھانے، بستروں اور تکیوں کے لمس سے وقتی لطف کشید کرنے کا سامان کرتی ہے۔

ایک اقتباس دیکھئے:۔

> ''بھوک لگی تھی ـــ۔ یہ ثابت پراٹھے اماں ابا کے لئے رکھ چھوڑے ہیں اور ـــ۔ یہ مردوں کے بچے ہوئے پراٹھے ہیں۔ تو کیا ہوا؟۔ پیٹ ہی تو بھرنا ہے نا !۔ سارے مسلمان آپس میں بہن بھائی ہوتے ہیں۔ کسی کافر کا جھوٹا تو کھا نہیں رہی تھی کہ نفرت کرتی یا دل نہ مانتا اور پھر نوروز لالا کے سبھی یار دوست صاف ستھرے رہتے ہیں ایک دو تو باقاعدہ نمازی بھی ہیں اب ان کا جھوٹا، جھوٹا تھوڑا

ہی ہوتا ہے !! اری شیرینو!! سب خواہ مخواہ کی فضول باتیں ہیں کہ عورتوں کو
پرائے مردوں کا جھوٹا نہیں کھانا چاہیے۔"
اور یہی شمو ایک جگہ گھر کی نوکرانیوں کے بارے میں کہہ چکی ہے۔"برتن حجرے
سے آئے نہیں ہوتے کہ یہ مردار ندیدیاں ان پر ٹوٹ پڑتی ہیں پرائے مردوں
کے جھوٹے برتن چاٹنے لگ جاتی ہیں۔۔۔۔ بے شرم بے حیا کہیں کی!!۔ پرائے
مشٹنڈوں کا جھوٹا چاٹنا عین ثواب سمجھتی ہیں۔"

(شیشم کا پتا 99,101)

بانو کا ایک اور بے مثال کردار" کلدار" افسانے کا ایک کوچوان ہے۔ ایک غریب بوڑھا کوچبان جو
پی ناکام محبت کا بوجھ بڑھاپے تک اپنے کاندھوں پر لئے پھرتا ہے وقت اس کے زخموں کو شاید بھر تو چکا
ہے مگر محبت کی ناکامی کا یہ زخم اپنا نشان چھوڑ جاتا ہے اور ایک محسوس کی جانے والی اداسی اور مایوسی بوڑھے
و چوان کی ذات کا مستقل حصہ بن جاتی ہے۔

"زندہ دکھ" کردار نگاری کے حوالے سے بانو صاحبہ کا ایک اور متاثر کرنے والا افسانہ ہے۔
اس افسانے کی ایک پختون بیوہ جوانی میں اپنی بیوگی کی چادر سنبھالے رکھنے کے ساتھ اپنے جوان
ہر کے قتل کا غم بھی یاد رکھتی ہے اور انتقام کے جذبے کو بھی تازہ رکھتے ہوئے وہ اس امید پر زندہ ہے کہ
ں کا بیٹا ایک دن اس قابل ہو جائے گا کہ اپنے بے گناہ باپ کے قتل کا بدلہ وہ رحیمے سے لے لے گا اور وہ
سے مار ڈالے گا۔ افسانہ اس وقت ایک خوبصورت موڑ پر پہنچ جاتا ہے جب اس بیوہ کا ڈاکٹر بیٹا صفی"
وں آتا ہے اور" رحیمے کاکا" بیماری کی حالت میں اس کو مدد کے لئے پکارتا ہے۔ ماں کا تقاضا ہے کہ
ر کا ٹیکہ لگا کر انتقام کی پیاس بجھاؤ جبکہ ڈاکٹری کے پیشے کی حرمت متقاضی ہے کہ زندگی بچاؤ۔

"صفی" اس صورت حال میں ایک ذہنی کشمکش سے دوچار ہے۔ بالآخر فیصلہ کرتا
ہے کہ معاف کر دینا بہرحال انتقام سے بہتر ہے۔ اس افسانے کا ہر کردار اپنی
جگہ مکمل ہے آیا کہ وہ" صفی" ہے" عادل" ہے" منھا" ہے یا کہ" رحیمے ماما"۔
" رحیمے ماما" جو صفی اور عادل کے باپ کا قاتل ہے اس وقت مفلوج حالت میں
چار پائی سے لگا پڑا ہے مگر وہ صفی کی ذہنی کیفیت بھانپ چکا ہے۔ صفی اللہ کے طور
پر نہیں، بلکہ حبیب کے جواں پشتون بیٹے کی حیثیت سے مجھے وہی سوئی لگاؤ جو

پہلے بھری تھی کہ میرے گناہ کا علاج وہی سوئی ہے۔ ڈرو نہیں۔ پختون بنو۔ وار کرو۔ سوچو مت۔ اس زندگی سے تو موت اچھی ہے۔ اور پھر موت بھی وہ موت جو جوانمرگ حبیبؔ کے بیٹے کے ہاتھ سے مجھے نصیب ہوگی"۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ بانو کے نسوانی کردار مردانہ کرداروں کی نسبت زیادہ مضبوط اور دیر تاثر چھوڑنے والے ہوتے ہیں۔ مگر انصاف کی بات یہی ہے کہ انہوں نے نسوانی کرداروں کے ساتھ ساتھ مردانہ کردار بھی نہایت خوبصورتی اور دیانتداری سے برتے ہیں۔ البتہ عورت ہونے کے ناطے بانو نے اپنی صنف کے درد کو قدر زیادہ شدت سے محسوس کیا ہے۔ ان کے زیادہ قریب گئی ہیں اور ان کی ذات کی باریکیوں کو زیادہ کامیابی سے پیش کرنے میں اسی طفیل کامیاب رہی ہیں۔

یہی سبب ہے کہ ان کے نسوانی کردار زیادہ واضح اور مضبوط نظر آتے ہیں۔ مثلاً "نتھ" جس کا پیشتر عنوان "نکی" ہے یا "تماشا تماشائی" یا "کانچ کے ٹکڑے"۔

"کانچ کے ٹکڑے" بانو صاحبہ کا ایک منفرد افسانہ ہے اس میں جنسی گھٹن کا ایک نئے اور مختلف پہلو سے جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ گھٹن عورت کی نہیں، ایک مرد کی ہے اس کا مرکزی کردار ظریفؔ ہے۔ ظریفؔ اپنی جنسی تشنگی کو مٹانے کیلئے پنگھٹ سے ملنے والی ٹوٹی چوڑیوں کے ٹکڑوں کو سنبھال کر رکھتا ہے جب اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ ٹکڑے اس کی اپنی بہن کی چوڑیوں کے ہیں تو ظریفؔ ایک اندرونی ہیجان کا شکار ہو جاتا ہے اور قاری کو ظریفؔ سے ایک گونا ہمدردی ہو جاتی ہے۔

میر من زیتون بانو کی تقریباً تمام کہانیاں ایسے کرداروں کے گرد گھومتی ہیں جو انہیں اپنی راہ میں نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ بے ضرر معصوم لوگ ہیں جو اکثر و بیشتر اپنی سادہ لوحی کے ہاتھوں یا پھر قسمت اور سماج کے ہتھکنڈوں کے سبب لٹتے رہتے ہیں مگر یہ لٹے پٹے بے بس لوگ اپنی سی سعی کر کے حالات کو سنوارنے کی ہر ممکن تدبیر کرنے کے خواہاں ہیں۔ ایسا ہی ایک "وقت کی دلہیز" کی زبیدہ یا پھر "بندر کی قبر" کا محب وطن انسان جو بڑے بڑے جرگوں میں کھڑا ہو جاتا اور رحم و انصاف کی باتیں کرتا ہے۔

دراصل بانو اپنی ساری کہانیاں اپنے ماحول سے اکٹھا کرتی ہیں۔ وہ انسانی دکھوں کو سمجھتی ہیں اور ان کی نباض ہیں اور اپنی اس خاصیت کو انہوں نے اپنے ایک شاہکار افسانے "فصیلیں" میں بڑی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے اس افسانے کے تمام کردار اپنے معاشرے اور ماحول کی گہری چھاپ لئے ہوئے ہیں۔ خان کاکا، 'کرمے' 'ککے' 'سجاد' 'سجاد کا دوست'۔ 'نیلی' 'زرو'۔ سب ایسے ہی تو کردار ہیں۔

'خان کاکا' پہاڑوں جیسا سخت دل اور بے رحم۔ 'زرو بی بی' تمام انسانی کمزریوں کا مرقع اور مجبور دل کی مالک۔ 'کجے' کا بدصورت مردانہ جذب۔ 'کرے' کا نا کردہ گناہ۔ ویسے اس افسانے کا سب سے بامعنی کردار ''کجے'' ہے۔ میرمن بانو نے اس کردار کو بڑی فنکاری سے تراشا اور پیش کیا ہے۔

یہ اور اس طرح کے بے شمار کردار زیتون بانو کی فنکارانہ صلاحیتوں کے غماز ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ بانو ہر کردار کے دل میں دھڑکتی ہیں۔ وہ انہیں خود سے نہیں گھڑتیں بلکہ ان کرداروں کا تار و پود انہیں اپنے گرد و پیش سے خود بخود مل جاتے ہیں۔ بس بانو کرتی یہ ہیں کہ ان کو افسانے کی ضرورتوں کے تحت تراش خراش کے ہمارے سامنے لاتی ہیں۔ گویا زیب داستاں کی خاطر کچھ بڑھا دیتی ہیں کچھ گھٹا دیتی ہیں۔

''چاہت اپنے لئے'' بانو کا ایک ایسا افسانہ ہے جس کا ہیرو ایک شاعر ہے۔ یہ خود پسند اور خود پرست شاعر انسان کی سچی تصویر ہے یا پھر ''نشہ'' کا حلیم نچلے طبقے کا ایک عام مرد ہے۔ جو گھر سے باہر زم اور خوش دل ہے مگر گھر آ کر ہوّا بن جاتا ہے اور اپنی مردانگی پر غصّے اور بدتمیزی کا کلف چڑھا کر ایک کمزور اور بے بس عورت، اپنی بیوی کو ڈرا دھمکا کر اپنی تسکین کرتا ہے۔ اپنی کردار نگاری کے متعلق خود بانو کا کہنا ہے۔

''یہ سب کے سب حقیقی کردار ہیں۔ ان کی بنت میں کسی قسم کی دروغ گوئی یا دروغ مصلحت آمیز کا تڑکا نہیں دیا گیا۔'' بلکہ ایک اور جگہ کافی دلچسپ بات کرتی ہیں کہ وہ لوگ جنہیں کردار بنا کر انہیں کہانیوں کا حصہ بناتی ہیں وہ تو ان باتوں کی خبر ہی نہیں رکھتے۔ ان کے اپنے الفاظ ہیں:

> ''انھوں نے میری کہانیاں پڑھی ہی نہیں ہوتیں اور نہ ہی ان کو علم ہوتا ہے کہ میں نے ان کے متعلق کچھ لکھا ہے۔ ویسے بھی وہ روایات میں جکڑے ہوئے ایسے گھرانوں کے کردار ہوتے ہیں جہاں رسالے یا کہانی پڑھنا شجر ممنوعہ ہوتا ہے۔
> ظاہر ہے ایسے میں اعتراض کا سوال کہاں اٹھتا ہے''۔

غرض محترمہ زیتون بانو نے اپنا ہر کردار نہایت اعتماد اور وثوق کے ساتھ پیش کیا ہے۔

مکالمہ نگاری:

نثری ادب، داستان، ناول، ڈرامے اور افسانے تک کا جتنا سفر بھی طے کرتا ہے کردار اور پلاٹ کے ساتھ ساتھ ان سب کا ایک لازمی جزو مکالمہ نگاری بھی رہا ہے۔ ظاہری بات ہے جہاں کردار ہوں گے

ان کے کچھ مخصوص جذبات، خیالات اور احساسات ہوں گے اور کہانی کار ان سب کو قاری تک دو ذرائع سے پہنچاتا ہے ایک تو وہ بیانیہ انداز میں حرکات و اعمال کے وسیلے کو استعمال کرتا ہے جبکہ دوسرا براہ راست طریقہ "مکالمہ" ہوتا ہے۔ کردار کیا سوچتا ہے، کیا محسوس کرتا ہے۔ کسی مخصوص واقعے کے بارے میں اس کا ردعمل کیا ہے۔

کہانی کو آگے بڑھانے کے لئے جو چیز مددگار ثابت ہوتی ہے وہ ہے کسی بھی کہانی میں موجود انسانوں (کرداروں) کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ۔ غم خوشی، غصہ یا نفرت، الجھن یا پریشانی، کوئی بھی کیفیت ہو اس کا اظہار کردار کی باتوں سے ہی ہوتا ہے۔

فکشن میں ہمیشہ سے مکالے کی اتنی ضرورت اور اہمیت رہی ہے کہ دنیا کی تقریباً ہر زبان کے ادب میں تمثیل (Alogary) باقاعدہ ایک صنف کے طور پر موجود ہے۔ جہاں غیر مجسم اور غیر ناطق کرداروں کو بھی لفظ کی دنیا سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ اور یہ الفاظ ہی تو ہیں جن کی بنیاد پر انسان دیگر مخلوقات سے ممتاز، دوسرے لفظوں میں منفرد ٹھہرتا ہے۔

مکالے کی یہی اہمیت ہے جس کے باعث دنیا کا ہر کہانی کار خواہ داستان گو ہو یا ڈرامہ نویس۔ ناول نگار ہو یا پھر افسانہ نگار اپنے فن پارے کے اس پہلو پر خاطر خواہ توجہ دیتا ہے۔

میرمن زیتون بانو کے افسانوں کی یہ بھی ایک اہم خاصیت ہے کہ ان کے ہر افسانے کا ہر کردار اپنی جنس، عمر، ماحول، حالات اور موقع محل کے مطابق بولتا نظر آتا ہے۔ اگر یہ کردار ایک بے بس مظلوم و مجبور اور پریشان حال ان پڑھ عورت ہے تو وہ اپنی باتوں سے یہی کچھ ثابت کرے گی اور اگر گاؤں کا ظالم، جابر، سخت گیر، خود پسند خان ہے تو اس کے لہجے اور گفتگو سے وہی رعونت اور نخوت ٹپکتی ہے جو ایسے کردار کے لئے ضروری ہے۔ محترمہ بانو اگر نئے عہد کا باشعور تعلیم یافتہ وسیع قلب و نظر کا جوان کردار سامنے لاتی ہیں تو اس کی بات چیت میں شائستگی اور تہذیب کو ضرور پیش نظر رکھتی ہیں۔ اسی لئے ان کا ہر کردار اپنی جگہ مکمل اور مؤثر ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً "موم کے آنسو" میں ایک بہن اپنے جوان بھائی کی موت کا ماتم کرتی ہے اور جب اسے بار بار قبرستان جانے سے منع کیا جاتا ہے اور صبر کو کہا جاتا ہے تو کہتی ہے۔

"ایک اکلوتے بھائی کا غم کبھی کم ہوگا؟۔ اور ایسی جوانمرگی کی موت!!۔ کلیجہ کٹ کٹ جاتا ہے دلہن کے چہرے سے گھونگھٹ بھی نہ اٹھا سکا۔ ہائے!! موت کو بھی ترس نہ آیا۔"

ایک بے بس غمزدہ بہن بھائی کی موت پر اس کے علاوہ اور کہہ بھی کیا سکتی ہے؟

محترمہ بانو کا ایک اور افسانہ "زندہ دکھ" بھی مکالماتی حسن کا ایک کامیاب مرقع ہے۔ ایک جوان عورت جو بیوگی کے دکھ جھیل کر انتقام کی امید پر زندگی بسر کر رہی ہے جب اس کا بیٹا جوان ہو جاتا ہے اور بدلہ لینے کے قابل۔ تو یہ بیٹے سے کہتی ہے۔

"جاؤ! صفی بیٹے جلدی کرو۔ وقت گزر رہا ہے۔ لیکن دیکھنا دل کو ڈولنے مت دینا۔ تیرے باپ کی روح بڑی بے قرار ہے۔ جلدی کرو خدایا!!۔ تیرا لاکھ شکر ہے۔ تو نے مجھے اس قابل کر دیا کہ اپنی بیوگی کی چادر سنبھالے پختو (غیرت) کے راستے پر چل رہی ہوں۔ جا بیٹے۔۔۔ دیکھنا۔۔۔ اپنے باپ کے بے گناہ جوان خون کو بھلا نہ دینا۔۔۔"

ہم جانتے ہیں کہ انتقام لینا انسانی فطرت ہے اور پھر پشتون جو بدلہ چکانا غیرت کی علامت تصور کرتا ہے خواہ بدلہ دوستی کا ہو یا دشمنی کا۔

ایسے معاشرے میں ایک جوان عورت اپنے شوہر کے قتل کا غم کیسے بھول سکتی ہے۔ وہ تو اس غم کو حرز جان بنائے رکھے گی اور یہ عورت یہی کرتی ہے اسی افسانے میں مصنفہ آغاز میں بتاتی ہیں کہ جب اس عورت "منعا" کی شادی ہو رہی ہوتی ہے تو اس کی ماں اسے کہتی ہے۔

"میری بچی!!! اب تم میرے گھر سے رخصت ہو رہی ہو اس کے بعد اب تمہارا گھر وہی ہے جہاں تم بند آنکھیں کھولو گی۔ میرے گھر میں تمہاری حیثیت اب محض مہمان کی سی ہو گی۔ اگر تم ناچاقی کا شکار ہو گئی تب بھی تیرے لئے میرے گھر میں جگہ نہ ہو گی۔"

ہم مشرق کے لوگ اس ماں کی طرح ہی تو سوچتے ہیں کہ بیٹی جس گھر میں بیاہ کر جا رہی ہے اب اس سے اس کا جنازہ ہی نکلے گا۔

میرمن بانو کے کردار چونکہ ایسے معاشرے کے افراد ہیں جو ایک تہذیبی تسلسل سے مربوط معاشرہ ہے۔ یہاں صدیوں کی مسافت طے کر کے انسان نے وہ تجربہ، وہ علم اور وہ فلسفہ سیکھا ہے۔ جو ایک عام انسان کو بھی شعور اور فہم عطا کرتا ہے۔ بالخصوص اس معاشرے کو بڑے بوڑھے عام الفاظ میں زندگی کی وہ گہرائیاں کہتے ہیں جو بے شمار کتابیں بھی عطا نہیں کر سکتیں۔ مثلاً افسانہ "موم کے آنسو" کی آخری

سطریں ملاحظہ ہوں۔۔۔"بیٹی! یہاں بہت سی مائیں، بہنیں، بھائیوں اور بیٹوں کی قبروں پر بے ہوش ہوتی رہتی ہیں۔ یہ سب قبریں اور مٹی کی یہ ڈھیریاں جو تم کو نظر آتی ہیں ان میں مدفون پیاروں کے۔ زخمی دلوں کا ڈھیر سارا لہو آنسوؤں کی شکل میں بہتا رہا ہے پھر دھیرے دھیرے وقت کے دھاگوں۔ ان زخموں کو رفو کر دیا ہے۔ اشکوں کی جگہ آہوں نے لے لی ہے۔ پھر یہ آہیں بھی وقت کی آندھی اڑا لے گئی ہے اور لوگوں کے دلوں سے پیاروں کی یادیں بھی سمیٹ لیں۔۔۔ وقت کی یہی آندھی ان قبرو پر گزر رہی ہے جس نے قبروں کو مٹی کی ڈھیریوں میں تبدیل کر دیا پھر ایک وقت آئے گا یہ ڈھیریاں بھی ناپید ہو جائیں گی اور لوگ اپنے ان پیاروں کی قبروں پر ہل چلا دیں گے۔"

یہ ہیں ایک بوڑھے گورکن اور قبرستان کے چوکیدار "شوضل بابا" کے الفاظ۔ مگر جو فلسفہ اس میں بیا ہوا ہے وہ اپنی جگہ ایک اٹل حقیقت ہے ہم میں سے کون ہوگا جو موت کے آہنی پنجوں میں اپنے کسی نہ کسی عزیز کو نہیں دیکھ چکا ہوگا۔ ہم بھی ان عزیزوں کی یاد میں زندگی کے شب و روز بسر کر ہی لیتے ہیں۔

باتو صاحبہ کے پشتو کے ایک افسانے "یوازے" (تنہا) میں افسانے کا مرکزی کردار قاریہ جس نے والدین اور بھائیوں پر اپنی جوانی اور کمائی وار دی اور ڈھلتی عمر میں جب ان سب نے اس کا ساتھ چھوڑا اسے اکیلے پن کے خوف نے آلیا۔ یہاں لفظوں کا جادو دیکھئے۔ خوف کی کیفیات کو کس ساحری سے باتو الفاظ میں ڈھالتی ہیں۔

قاریہ کا ویسے بھی اب لوگوں پر سے اعتبار اٹھ چکا تھا۔۔۔"اللہ!!۔۔۔پھر رات آگئی۔۔" وہ رات کا خیال آتے ہی سرتاپا لرز گئی۔۔اگر پھر وہ۔۔۔پھر وہ۔۔۔اگر پھر؟؟۔۔۔پھر کیا؟؟۔۔۔۔"

وہ پاگلوں کی طرح خود سے مخاطب تھی۔۔۔پھر اس کو مہری چاچی والی بات یاد آ گئی۔۔"ہائے!!۔۔۔ پھر کیا ہوگا؟؟۔۔۔وہ مہری چاچی پر جو جن عاشق ہو گیا تھا اور۔۔۔وہ جو رات کو اس کے پاس آیا کرتا تھا!!۔۔اگر یہ؟؟۔۔۔ہائے ماں۔۔۔اوئی ماں!!۔۔۔"

لفظوں کے ساتھ کھیلنا اور خیالات کی لڑیاں پرونا کوئی باتو سے سیکھے۔ ہر مکالمہ متعلقہ کردار کے ذہن میں جھانک کر لکھنے کا ہنر جتنا باتو کو آتا ہے یہ بہت کم افسانہ نگاروں کو نصیب ہوا ہوگا۔

اسی خوبی کے پیشِ نظر انہوں نے جس موضوع پر قلم اٹھایا خواہ وہ غیر اہم ہی کیوں نہ ہو انداز بیاں اور حقیقت پسندی کی بدولت اس کو امر کر ڈالا۔

"سوغات" نامی افسانے میں ایک خاتون اپنی کہانی سناتی ہے جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی اس

کے جذبات واحساسات کی نزاکت ملاحظہ ہو:

"میری ابھی منگنی ہوئی تھی کہ سسرالی رشتہ دار مجھے بہت اچھے لگنے لگے تھے۔ جب اکیلی بیٹھی ہوتی تو خیالوں میں ان دیکھا دیور مجھے "بھابھی" کہہ کر بلاتا۔ میں اپنے آپ سے شرما جاتی۔ شرم مارے سمٹ جاتی۔ جسم کا خون اچھل جاتا میکے سے سسرال کی دہلیز تک۔۔۔"

گھریلو اور عام موضوعات کے علاوہ بانو صاحبہ نے عالمگیر انسانی مسائل کو بھی اپنے افسانوں اور شاعری کا موضوع بنایا۔ "ورثہ" ایک افسانہ ہے جو دنیا میں قتل و غارت گری اور انسانی نسل کشی کے موضوع پر نہایت ہی لطیف اور پر کار طنز ہے۔ اس افسانے میں نسل نو کی زبانی انسان کی وحشت و بربریت کو بڑے سبق آموز انداز سے پیش کیا گیا ہے جس کو پڑھ کر سب کے ذہنوں میں سوال اٹھتے ہیں اور ان کا ایک ہی جواب ہے کہ دنیا کے تمام مسائل کا حل امن و آشتی اور محبت میں ہے ان کا حصول صرف اپنے لئے نہیں، سب کے لئے ضروری ہے۔

دیگر خوبیوں کے علاوہ جاندار مکالمے اور حقیقت سے قریب تر کردار بانو کی کامیابی کا راز ہے۔

اسلوب اور زبان و بیان :

ادب چونکہ زندگی کا ترجمان ہے اس واسطے کسی بھی ادب پارے کے لئے سب سے ضروری چیز ابلاغ ہے۔ مصنف کیا کہنا چاہتا ہے اور اپنے مافی الضمیر کو کس طرح قاری تک پہنچاتا ہے۔ یہ وہ کسوٹی ہے جس پر کسی بھی ادب پارے کو پرکھا جاتا ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ مصنف اور قاری کا رابطہ الفاظ کے ذریعے ہی قائم ہوتا ہے اصل میں ادب ایک تکون پر مبنی ہے۔

مصنف کچھ سوچتا ہے اور محسوس کرتا ہے پھر اپنے ان محسوسات اور خیالات کو وہ تحریر کی صورت میں قاری تک پہنچاتا ہے اور قاری اسے پڑھ کر کچھ تاثرات اخذ کرتا ہے۔ ظاہر ہے مصنف اپنے ان خیالات اور احساسات کو الفاظ کے ذریعے ہی پیش کرے گا۔ اب اگر یہ الفاظ قاری کی سمجھ میں آجاتے ہیں تو

ابلاغ ہو پاتا ہے ورنہ نہیں۔ گویا ثابت ہوا کہ زبان و بیان اور الفاظ و اسلوب ادب پارے کی خوبصو
اور کامیابی کا جزو لاینفک ہے اور اس جزو پر کما حقہ، توجہ، دینا مصنف یا ادیب کا فرض ٹھہرا۔ مگر یہاں
بات محل نظر رہے کہ اسلوب میں اور زبان و بیان کے استعمال میں کسی قسم کی بھی بناوٹ ادب پارے
حسن کو گہنا دیتی ہے۔ گویا اسلوب اور انداز بیان ایک ایسی پتلی رسی کے مترادف ہے جس پر چل کر اد
یا مصنف پار گزرتا ہے اور قاری سے کامیابی اور قبولیت کی سند وصول کرتا ہے یہی سبب ہے کہ ہر بڑ
فنکار کے ہاں اس خوبی کا پایا جانا قاری اور نقاد کی توقع اور خواہش ہوتی ہے۔

اسلوبیاتی اعتبار سے زیتون بانو ایک بڑی فنکارہ ہیں ان کے افسانے زبان و بیان کے اعتبار سے
مثال آپ ہیں۔ بانو کہانیاں بیانیہ انداز سے پیش کرتی ہیں ان کے ہاں نہایت روانی، سلاست ا
سادگی نظر آتی ہے۔ وہ اپنے ماحول اور معاشرت کے پس منظر کے حوالے سے الفاظ چنتی ہیں اور استع
کرتی ہیں۔ اور ان کی یہ خاصیت ان کے افسانوں کو ایک مٹھاس اور شیرینی بخشتی ہے۔ زبان و بیان
حوالے سے بانو صاحبہ کی ایک دین ملکی اور قومی سطح پر یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اردو افسانوں میں سر
کے مقامی الفاظ کو بے حد خوبصورت طریقے سے برتا ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار بھی اپنی گفتگو
ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو پشتو زبان کے الفاظ ہیں پشتو بات چیت میں مستعمل ہیں۔ اس طر
پشتو کے یہ الفاظ اردو پڑھنے والے قاری تک پہنچ جاتے ہیں۔ اسی سلسلے میں اردو کے مشہور کالم نگار، صحا
اور ادیب محترم عبدالسلام خورشید نے بانو کو ایک بار فرمایا تھا۔

> ''یہ جو آپ نے طبع زاد اردو افسانے کا نام ''پیغور'' رکھا ہے یہ ایک مستحسن قدم
> ہے۔ اس میں دونوں زبانوں کا فائدہ ہے۔ حالانکہ آپ کو فٹ نوٹ میں توضیحی
> نوٹ بھی دینا پڑا تھا کہ ''پیغور'' اس طعنے کو کہتے ہیں جس پر پشتون مرنے کو تیار
> ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی آپ نے اپنے کسی اور افسانے کو خود ہی اردو کا جامہ
> پہنایا تھا اس میں آپ نے غیرت کے لئے پشتو نام ''پختو'' استعمال کیا تھا۔ ایسی
> کوشش پر آپ مبارکباد کی مستحق ہیں۔۔۔''

یقیناً یہ زیتون بانو صاحبہ کا ایک کارنامہ تصور کیا جانا چاہئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بانو اپنے کردارو
کے نام بھی پشتو زبان سے لیتی ہیں جیسے کشورو، زرو، قیشمرہ، منحا، زرگل، رحیمے، مارو، کرمے، خان کاکا
تجیرہ، زیبو، شینو گئے، شمو، وغیرہ۔ خواہ افسانے اردو کے ہوں کہ پشتو کے درحقیقت بانو کے افسانے

اور اچھوتے اسلوب، علاقائی رنگ آمیزی اور اجلی سوچ کے جدید زاویوں اور شگفتہ طرز بیان کے اچھے نمونے ہیں۔محترمہ زیتون بآنو کے پشتو افسانے تو خیر ہیں ہی اپنی نمائندہ زبان کے کامیاب ادب پارے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ جب سے بآنو نے اپنے افسانوں کے اردو ترجمے کو کامیابی سے ہم کنار ہوتے دیکھا تو اردو میں لکھنے کا آغاز کر دیا۔ایک پشتو خوان ہونے کے ناطے یہ ممکن تھا کہ وہ اردو زبان و بیان کے تقاضوں پر پوری نہ اتر تیں مگر انہوں نے ثابت کر دیا کہ وہ پشتو کے ساتھ ساتھ اردو زبان بھی خوبصورتی سے استعمال کر سکتی ہیں اور پھر اپنی تحریروں میں پشتو زبان کی پیوند کاری نے جو مٹھاس، معنی خیزی اور شیرینی پیدا کر دی ہے وہ خاصے کی چیز ہے۔

میر من بآنو غیر ضروری طویل جملوں اور غیر متعلق ثقیل الفاظ سے گریز کرتی ہیں کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ ان کے استعمال سے کوئی خاص فائیدہ نہیں ہوتا۔الٹا ایک طرح کی بناوٹ کا احساس ہوتا ہے جس سے تحریر کا حسن ماند پڑنیکا احتمال ہوتا ہے۔

دراصل میر من بآنو کو لفظ کی حرمت کا پورا پورا احساس ہے نیز وہ الفاظ کے مزاج اور دروبست سے بھی بخوبی واقف ہیں۔وہ موضوع اور ماحول، نیز کرداروں کی نفسیات کو دیکھ کر زبان اور اسلوب کا استعمال کرتی ہیں۔غیر ضروری تفصیلات میں نہیں پڑتیں بلکہ موزوں ترین الفاظ مناسب انداز میں پیش کر کے اپنی تحریر کو چار چاند لگا دیتی ہیں۔

غرض اسلوبیاتی لحاظ سے زیتون بآنو کی تحریریں چاہے پشتو کی ہوں یا اردو کی، شاعری ہو یا نثر، افسانہ ہو یا ناول یا ڈرامہ، اپنی مثال آپ ہیں اور ثابت کرتی ہیں کہ محترمہ بآنو اپنی منفرد فکر کو خوبصورت لباس دے کر فن کو بھی ایک مثالی نمونہ بنا دیتی ہیں۔

جناب ڈاکٹر سلیم اختر بآنو کے انداز تحریر کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

> ''زیتون بآنو کے فن کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ اسے جہاں بات کہنے کا سلیقہ آتا ہے وہاں وہ بات چھپانے کا گر بھی جانتی ہے۔ویسے تو یوں بھی بات چھپانے اور خاص طور پر دل کی بات چھپانے میں خواتین بطور خاص ماہر ہوتی ہیں لیکن جب زیتون بآنو نے اس خصوصیت کو اپنے فن میں سمو دیا تو ''آنکھیں''، ''خود فریبی''، ''چاہت اپنے لیے'' اور ''نشہ'' جیسے افسانے تخلیق کیے۔یہ ایسے افسانے ہیں جو اپنی سادہ بیانی میں بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔بلکہ ان

افسانوں کی دلکشی کا راز ہی اس میں مضمر ہے کہ زیتون بانو نہ کہہ جانے کے گر سے آگاہ ہیں۔۔۔"3

اسلوبی اعتبار سے بانو کے پشتو افسانے مثالی افسانے ہیں۔مثلاً ایک افسانے "بوزے" (ہاتھ کا پنکھا) میں ایک نسوانی کردار "قیشو" کہتی ہے۔

زهريتې شه يو دومره بيسې واخلي چې خلق اولوټي اوبل لا خوراکونه هم دباچاها نو کوی"4

ترجمه:۔

"زہر کھائیں!! یک تو اتنے پیسے لیتی ہیں کہ لوگوں کو لوٹ جاتی ہیں اوپر سے خوراک بھی بادشاہوں والی کھاتی ہیں۔"

یہ ایک عام سیدھی سادی پشتون عورت ہے جو مردانخانے میں ناچنے والی طوائیفوں کو کوسنے دے رہی ہے کہ اسے ان کے کھانے پینے کا انتظام کرنا ہے۔مگر یہ بددعا اور کوسنے غالباً صرف اس اضافی کام کے باعث نہیں ہیں۔بلکہ اس نفرت اور جلن کا نتیجہ ہے جو اس کے دل میں پل رہا ہے۔

"قیشو" کے اس غصے کے اظہار کے جواب میں اس کا شوہر اس سے جس انداز میں بات کرتا ہے وہ پشتون مرد کی مکمل عکاسی کے لئے نہایت مناسب ہے۔وہ کہتا ہے۔

"ته اوس خوشې قړ تې پريګده . شابه شه انتظام او کړه "

ترجمه:۔

"اب تم بکواس رہنے دو۔جلدی کرو۔کچھ انتظام کرو۔"

غرض اسلوب، زبان اور بیان کے اعتبار سے بانو کے افسانے اس لئے اہم ہیں کہ ان میں پشتو زبان کا روزمرہ، محاورہ اور ضرب الامثال پوری معنویت مٹھاس، چٹخارے اور لطافت کے ساتھ موجود ہیں۔اور اس کو ایک پشتون قاری جس طرح محسوس کرسکتا ہے اور حظ اٹھاتا ہے۔شاید کسی غیر پشتون کو ویسا نہ لگے۔

اس سلسلے میں جناب محمد علی صدیقی رقمطراز ہیں:۔

"زیتون بانو کے افسانوں میں صوبہ سرحد کا مخصوص طرز احساس اور اس طرز احساس کے پس پشت جغرافیہ اور ثقافت کا معروضی تلازم ہے اور اس طرح یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ان کے افسانوں کے اردو تراجم سے اردو ادب

کے قارئین کے لئے پاکستان کے ایک اہم علاقے کی ثقافت اور انسانوں کے رشتوں کی دل آویز حد تک معنی خیز کہانیاں بہم ہوگئی ہیں۔

زیتون بانو ترقی پسند افسانہ کی روایت کی افسانہ نگار ہے۔ جب وہ اردو تراجموں میں اس قدر تعجب انگیز حد تک حقیقت پسند نظر آتی ہیں تو پھر پشتو میں تو وہ ''انقلابی افسانہ نگار'' شمار ہوتی ہوں گی۔۔۔۔''

منظر کشی:

کہتے ہیں:۔Seeing is Believing

یعنی ہم خود جو دیکھتے ہیں اس پر یقین رکھتے ہیں اور اسی پر ایمان لاتے ہیں۔ مگر یہ ایک دلچسپ امر ہے کہ ادب کے زاویے سے دیکھیں تو دیکھنے کا یہ عمل ایک قطعی مختلف صورت اختیار کر لیتا ہے۔ کیونکہ کسی بھی ادب پارے کو ہم پہلے مصنف کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور پھر اسے اپنے تصور اور تخیل سے اپنے ذہنی سٹور میں محفوظ کر لیتے ہیں اور افسانوی ادب میں تو ہم دیکھتے ہی مکمل طور پر مصنف کی آنکھ سے ہیں۔

قدیم اصناف ادب پر نظر ڈالیں تو ہمیں Seeing is believing کا بہترین نمونہ داستانوں کی صورت میں نظر آتا ہے۔ داستان گو، سننے والوں کو وہ سب کچھ دکھاتا ہے جو وہ دکھانا چاہتا ہے۔ اپنے جادوئی طرز بیان کو استعمال کرتے ہوئے وہ ان سب چیزوں کو بھی مجسم بنا دیتا ہے جو شاید عالم اجسام میں موجود بھی نہ ہوں۔ اپنے اسی ساحرانہ طرز بیان کے طفیل ہی وہ مجلس میں بیٹھے ہوئے داستان سننے والے لوگوں کو سمندروں، پہاڑوں، غاروں، محلوں، قلعوں وغیرہ کی سیر کروا دیتا ہے۔ انہیں طویل ترین دور دراز خطوں کی مسافت لمحوں میں سر کرواتا ہے لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان سب مناظر کو سننے والوں کے فہم اور ذہنی استعداد کے مطابق ہی پیش کرے تا کہ یہ سب کچھ بعید از قیاس ہوتے ہوئے بھی خارج از امکان نہ دکھ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم دور میں داستان گو اور پھر ناول نگار، ڈرامہ نویس اور افسانہ نگار کسی بھی کہانی کی بنت میں منظر کی پیش کش کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز نہیں کرتا بلکہ اس جزو میں اپنی پوری فنی مہارت اور چابکدستی کا مظاہرہ کرتا ہے یا کرنے کی کوشش لازماً کرے گا۔

افسانہ جیسی مختصر صنف کے لئے منظر نگاری کی اہمیت یوں بھی ضروری ہے کہ افسانہ نگار کو مختصر اور جامع انداز میں تمام اہم معلومات اور ناگزیر جزئیات بہرحال پیش تو کرنی ہی ہوتی ہیں۔ سو ایک ذہین افسانہ

نگار منظر کشی کو کسی بھی صورت نظر انداز کرنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔اس کی کوشش ہوتی ہے کہ تحریر میں دیئے جانے والے پیغام کے ابلاغ میں منظر سے بھر پور مدد لی جائے۔

میر من زیتون بانو کی افسانہ نگاری کی ایک اہم خوبی ان کی بھر پور اور جامع منظر کشی بھی ہے وہ اپنے افسانوں کے پس منظر کے طور پر منظر کشی کو استعمال کرتی ہیں اور غیر ضروری یا غیر متعلقہ مناظر سے افسانہ کی فضا کو بوجھل نہیں بناتیں۔

ان کے اکثر افسانے چونکہ سرحد کے دیہاتی ماحول کے تناظر میں لکھے گئے ہوتے ہیں اس لئے ان افسانوں میں پس منظر بھی اسی تناسب سے دکھایا گیا ہے۔ان کا ایک افسانہ''سوغات''منظر نگاری کی بہترین مثال ہے افسانہ آغاز سے انجام تک، جیسے جیسے آگے بڑھتا جاتا ہے مناظر اسی مناسبت سے آگے بڑھتے رہتے ہیں۔گاؤں کے پس منظر میں کہانی کی اٹھان۔دو پڑھے لکھے انسانوں کا باہمی ملاپ جو دو متوسط خاندانوں کو شیر و شکر کرنے کے سبب گھر جنت کا نظارہ پیش کر رہا ہے۔پھر محکمہ جنگلات کا ریسٹ ہاؤس اور اس کے نواح میں سینکڑوں چھوٹے بڑے درخت اور انہی درختوں میں سے جب عورت ایک آگ اگلتے درخت کو دیکھ لیتی ہے جس کی گود میں ایک نیا ننگ دھڑنگ بلکتا انسان نظر آرہا ہے۔تو وہ بے قابو ہو جاتی ہے۔اور دوڑ کر ان دونوں کو سہارا دیتی ہے۔تب اسے معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ تو ایک عورت ہے اس جیسی جو ایک بچے کو سینے سے لگائے ندی کے پار جنگل میں کھڑی بے بسی اور لاچارگی کی تصویر ہے۔خاتون یہ سارا نظارہ پہلے اپنے اندر کی آنکھ سے اور پھر باہر کی آنکھوں سے حقیقت میں دیکھ کر ایک فیصلہ کرتی ہے۔''سوغات''افسانہ پڑھنے کے دوران اور بعد میں قاری کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ پورا افسانہ ایسی ہی منظر کشی کا ایک مرقع ہے جس میں انسان کے اندر کے سوکھے کانٹے دار درختوں کے جنگل اور باہر کے ہرے بھرے پھل دیتے درختوں کے جنگل پیش کئے گئے ہیں۔

پورے افسانے میں ہم کو مناظر کی پیشکش میں کوئی ایسا غیر متعلق نکتہ نظر نہیں آتا جس کا افسانے کے موضوع اور مرکزی خیال سے رابطہ نہ ہو۔

بہر حال تکنیکی اعتبار سے زیتون بانو کے افسانے ادب کے پیمانے پہ پورے اترتے ہیں اور ان میں کسی بھی قسم کا جھول نظر نہیں آتا۔

ان افسانوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفہ افسانے کے فن کی روایت سے پوری طرح آگاہ ہیں اور اس صنف کی ہیئتی ضروریات سے باخبر ہیں۔یہی وجہ ہے کہ افسانے اپنی صنف میں بہترین کہلائے

...نے کے قابل ہیں اور بانو کی افسانہ نگاری پر دلیل ہیں۔

میر من بانو کی افسانہ نگاری کی پختگی، ادبیانہ شان اور معیار کے بارے میں کوہاٹ کے جناب احمد اچہ کا یہ کہنا درست ہے کہ۔۔۔

> ''گزشتہ برسوں میں جن افسانہ نگار خواتین نے اپنے فن کی بدولت اپنے نام کو منصب اعتبار تک پہنچایا ان میں زیتون بانو خاصی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ان کا فن خلوص، فکر اور عمدہ لب و لہجے کا عکاس ہے۔''

بانو کی افسانہ نگاری کی خصوصیات:

روئے زمین پر ہر ذی روح اپنا ایک انفرادی تشخص رکھتا ہے اور بالخصوص اشرف المخلوقات، بنی نوع نسان اپنی ذات اور حیثیت میں ایک انفرادیت کا حامل ہے اور یہی انفرادیت ایک انسان سے دوسرے نسان کو الگ اور ممتاز کرنے کا وسیلہ ہے۔

انفرادی خصوصیت اور مختلف جہات کا مالک یوں تو ہر انسان کا خاصہ ہے مگر تخلیقی شخصیت کے لئے یہ نفرادیت ناگزیر وصف ہے کہ ایسی انفرادیت اسے دوسرے فنکار سے تمیز کرتی ہے۔مثال کے طور پر ہم یکھتے ہیں کہ ہر گانے والا خوش گلو ہوتا ہے۔یا ہونا ضرور چاہئے۔مگر ہر خوبصورت آواز خوبصورت ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔حسین چہرے بے شمار ہیں مگر ایک دوسرے سے قطعی مختلف۔ہر مصور تصویر بناتا ہے مگر ہر ایک کا انداز جداگانہ ہوتا ہے گویا فن بھی انفرادیت کا متقاضی ہے ور پھر اسی انفرادیت کے توسط سے ہم کسی کو صاحب اسلوب، صاحب طرز، اور منفرد فنکار وادیب کے خانوں میں علیحدہ علیحدہ رکھ لیتے ہیں۔

افسانہ کہنے کو تو مختصر کہانی ہے جس کی تکنیک ایک مگر پیشکش کا انداز ہر افسانہ نگار کا مختلف ہوتا ہے۔گویا سالہ ایک، اجزا ایک مگر ذائقہ الگ ہوتا ہے۔تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ذائقے میں یہ فرق کیونکر وجود میں آتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ہر افسانہ نویس اپنی کچھ انفرادی خصوصیات رکھتا ہے جس کے باعث وہ دوسرے افسانہ نگار سے مختلف نظر آتا ہے ورنہ تکنیک تو کم وبیش سب کی ایک ہی ہوتی ہے۔

میر من زیتون بانو بھی ایک ایسی ہی افسانہ نگار ہیں جنہوں نے اپنی خصوصیات کی بنا پر افسانہ نگاری کے میدان میں ایک الگ انفرادی، نمایاں اور ممتاز مقام حاصل کیا ہے۔

ذیل میں ان کی افسانہ نگاری کی خصوصیات کا ایک سرسری اور مختصر سا تجزیہ پیش کیا جارہا ہے۔

مقامیّت اور آفاقیت :

باؔنو نے یوں تو سرحد کے پختون معاشرے کی ترجمانی کرنے والے افسانے لکھے ہیں مگر چونکہ یہ انسان، انسانی زندگی، انسانی دکھ درد، رنج والم، انسانی امنگوں اور آرزؤں پر مبنی ہیں اور انسان بنیادی طور پر ہر جگہ ایک سے ہیں اور بنیادی جذبے بھی ہر خطے، ہر علاقے تقریباً ہر معاشرے اور ہر ماحول میں یکساں ہوتے ہیں لہٰذا ان افسانوں میں بیک وقت مقامیت اور آفاقیت موجود ہیں۔

محترمہ باؔنو کے افسانوں کی دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے ہاں مقامیت ہر ہر جگہ نمایاں ہے۔ اور پھر ایک عمدہ اور معیاری ادب پارہ ہوتا ہی اس خوبی سے مملو ہے۔ وہ ادب جو اپنے معاشرے اور اس کی روایات کے تناظر میں تخلیق نہ کیا جائے اور اس معاشرے کے اثرات کا انجذاب اس ادب پارے میں نہ ہو تو وہ ادب اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

ادب ماحول سے بے نیاز رہنے والی چیز نہیں ہے اور نہ ہی ہوا بند ڈبے میں سانس لے سکتا ہے۔ ارد گرد کا ماحول، قرب وجوار میں موجود زندگی، اس زندگی کے چھوٹے بڑے معاملے، ان معاملات سے اثر پذیر ہونے والے انسان، ان انسانوں کے متشکل ہونے والے رویے، ان رویوں سے ادلتی بدلتی معاشرتی، معاشی، سماجی اور اخلاقی صورت حال، ان سب چیزوں کو خواہ یا نخواہ، شعوری سطح پر یا لاشعوری طور پر ادیب کو اپنی تحریروں میں استعمال کرنا ہی پڑتا ہے اور یہی وہ مقام ہوتا ہے جب تحریر میں مقامیت کی خصوصیات در آتی ہیں۔ اور یہی وہ خصوصیت ہوتی ہے جو ادیب کو اپنے لوگوں سے سند قبولیت دلاتی ہے۔ مگر کیٹس کے مطابق A thing of beauty is a joy forever۔ چنانچہ ہر ادب پارہ مقامیت کی خصوصیت کے باوجود اپنے اندر آفاقی اقدار کی خاصیت بھی رکھتا ہے۔ اور یہ خوبی باؔنو کے افسانوں میں موجود ہے۔

جہاں محترمہ باؔنو کی تحریروں میں مقامیت کا عکس ملتا ہے وہاں افسانے اپنے مزاج میں کچھ گمبیر ہو جاتے ہیں۔ ان افسانوں کی انفرادیت یہ ہے کہ ان میں کچھ پر ایک ہمہ گیر فضا بھی چھائی ہوئی ملتی ہے۔ وہ انسان کے بنیادی جذبوں اور احساسات کی بات کرتی ہیں۔ ان کے کردار اپنے غموں پر روتے بھی ہیں۔ پریشان بھی ہوتے ہیں۔ مگر ان پریشانیوں کو دور کرنے کی تگ و دو میں کوشاں بھی رہتے ہیں۔ خوش ہوتے ہیں تو اس کا اظہار کرتے ہیں۔ حسد کرتے اور حسد کا شکار ہوتے ہیں۔ قسمت، حالات اور ظالم

کے ہاتھوں رُلتے ہیں۔ اپنی بدحالی اور استحصال پر احتجاج کرتے ہیں۔ یہ سارا کچھ انسان کا ردعمل ہے۔ چاہے وہ انسان سرحد کا ہو، سندھ کا پنجاب یا بلوچستان کا۔ یا پھر ملکی سرحدوں کے پار کسی بھی براعظم کا، کسی بھی خطے یا علاقے کا ہو۔ اسی وجہ سے ان کے ہاں ایک انفرادی خصوصیت ظاہر ہوتی ہے اور وہ آفاقیت اور مقامیت کا ایک حسین امتزاج۔ اس امتزاج کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر باَنو کے فن کے بارے میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

> ''ایک حساس کہانی کار ہونے کی بنا پر وہ انسانی زندگی کی المیوں کی تصویریں پیش کرتی ہے۔ باَنو کے افسانوں میں ایسا انسان ملتا ہے وہ انسان جو اپنے دکھ درد، خوشی، آرزؤں اور تمناؤں میں صرف ایک انسان ہوتا ہے۔ پنجابی، سندھی، بلوچی یا پشتون نہیں ہوتا۔ یوں اس کے افسانوں کو دیکھیں تو ان میں پاکستان اور اس کے عوام کی روح زندہ اور بیدار نظر آتی ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ زیتون باَنو کے افسانوں کا Locale تقریباً ہمیشہ سرحد کے ارد گرد نواح کا علاقہ بنتا ہے اور اس طرح ہونا ہی درست ہے کیونکہ اس نے جس ماحول میں آنکھ کھولی، جس معاشرے نے اسے اس کا تشخص عطا کیا اور جہاں کی مٹی سے اس کے وجود کا خمیر اٹھا ان سب کا تقاضا یہی تھا کہ وہ ان کی عکاسی کرتی۔''

پختون معاشرت اور عورت کی عکاسی:

باَنو نے اپنے پختون معاشرے اور روایات کی ترجمانی کی اور اپنے فن میں ان روایات کی پوری پوری پاسداری بھی کی ہے۔ پختون کیا سوچتے ہیں۔ کیا محسوس کرتے ہیں، ان کی دوستی کیا ہے اور دشمنی کس نوعیت کی ہے۔ وعدے کا مقام ان کے لئے ایمان کی طرح کیوں ہے۔ غیرت کا تصور ان کے ہاں کیا ہے۔ محبت اور نفرت میں کس حد تک جاتے ہیں۔ مہمان نواز ہیں مگر اپنی ضد کے پکے ہیں جان دیدیتے ہیں مگر اپنی بات سے ہٹنا ان کے لئے ممکن نہیں ہے۔ بانو نے ان ہی حقیقتوں پر لکھا اور خوب لکھا۔ اسی لئے تو ہر نقاد باَنو کی یہی خوبی بیان کرتا ہے کہ زیتون باَنو پختون معاشرے کی ترجمانی کرتی ہیں۔ مگر باَنو کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے عورت اور بالخصوص پختون عورت کی ترجمانی اور نمائندگی کی اور اس ترجمانی کا باَنو نے صحیح حق ادا کیا ہے۔

دراصل سرحد جیسے روایتی ماحول اور معاشرہ میں رہتے ہوئے جب وہ عورتوں کے تنگ پیروں راستے میں بکھری ہوئی کنکریاں اور کانٹے چبھتے دیکھتی ہیں تو ان کے دل سے درد کی ٹیسیں نکلتی ہیں او سوچتی ہیں کہ کیا زندگی عورت کے لئے ان نوکیلی کنکریوں پر چلنے کا نام ہے؟ کیا عورت کے نصیب یہی لکھا ہے؟ کیا یہ روایت یونہی چلتی رہیگی؟ کیا حالات کبھی نہیں بدلیں گے؟؟۔

غرض باَنو نے دیکھا کہ عورت اپنی ذلت کی صلیب اٹھائے کھڑی ہے۔اس بے بسی،مظلومیت اور کی بالادستی پر مبنی اپنے اس معاشرے کو دیکھ کر۔یہ معاشرہ جو سرحد کا ہی نہیں ہمارے ملک کے ہر صو۔ ہر دیہات ،ہر گاؤں اور ہر علاقے میں ایسا ہی ہے۔

باَنو نے دیکھا محسوس کیا اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب عورت یعنی صنف نازک کی مظلومیت ، بسی اور بیچارگی نے اسے قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔اور اس نے اسی عورت کی کہانی ہمارے سامنے پیش تا کہ وہ اپنی صنف کی مدد کر سکے اور اپنی تحریروں کے ذریعے ان عورتوں کے حق کے لئے آواز اٹھا سکیں.

اس سلسلے میں باَنو صاحبہ خود ایک موقع پر کہتی ہیں۔''میں ثابت نہیں کرتی۔ایک حقیقت یہ ہے کہ پشتو معاشرے میں عورت کا کوئی مقام ہی نہیں ہے باپ ہے تو وہ بیٹی کو وہ درجہ نہیں دیتا جو اولاد ہونے ۔ ناطے بیٹی کا حق بنتا ہے۔بھائی ہے تو وہ بہن کا نام تک سننے کا روادار نہیں۔شوہر ہے تو وہ بھی ان ۔ مختلف نہیں۔یہ سب اسے مٹی کے ڈھیر سے زیادہ کی حیثیت دینے کو تیار نہیں۔''ایک اور جگہ کہتی ہیں۔

> ''میرے ذہن میں صرف ایک چیز ہوتی ہے اور وہ یہ کہ عورت ایک ایسی تخلیق ہے جو بہت اونچا درجہ رکھتی ہے کیونکہ وہ تخلیق کرنے کی صلاحیت سے سرفراز کی گئی ہے۔لیکن المیہ یہ ہے کہ وہ جن مردوں کو تخلیق کرتی ہے وہی اس پر ظلم ڈھاتے ہیں۔تخلیق کو خالق پر ظلم کرتے دیکھ کر میرے دل میں سوئیاں سی چبھنے لگتی ہیں۔دل میں ہوک سی اٹھنے لگتی ہے۔یہی عورت کا دکھ ہے اور یہی میرے افسانوں کا موضوع ہوتا ہے۔''

محترمہ باَنو کا یہی احساس ہے جو اسے اپنے افسانوں میں اس بے بس،لاچار اور مجبور عورت کے المیے کا ذکر کرنے پر اکساتا ہے۔ان کے بیسیوں افسانے اسی قسم کے موضوعات پر لکھے گئے ہیں۔

ان افسانوں میں ہم کو''مارو''اور اس کی بہن نظر آتی ہے۔جن کی زندگیاں اور جوانیاں خاندانی فرسودہ رسومات کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ایسی دلہنیں بھی ان کہانیوں میں ملتی ہیں جن کے سہاگ کو جوانی میں تو

بیوگی کی چادر اوڑھا دی گئی جیسے زندہ دکھ کی منھا۔'' میں بیوہ نہیں ہوں'' ۔ افسانے کی '' جمیلہ'' اور
'' پوازے'' کی '' قاریہ'' اور '' نتھ'' کی ماروا اور اس کی بڑی بہن۔

ان افسانوں میں ایسے جوان بھی ملتے ہیں جو تعلیم پانے کے بعد باپ کے قاتل کو موقع ہاتھ آنے کے باوجود فراخدلی سے معاف کر دیتے ہیں اور بیوہ ماں کے جذبۂ انتقام کو درگزر کے جذبے سے ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ ایسی دوشیزائیں بھی نظر آئیں گی جن کی دوشیزگی کے چاند کو درندگی کا گہن لگ گیا ہے۔ ان ہی میں ایک ایسی لیڈی ڈاکٹر بھی ہے جو اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور ہونے کے باوجود اپنے ساتھ کام کرنے والوں کی سازشوں کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ جیسے '' چلیچی'' افسانے کی مہتابہ اور ایسی لڑکی بھی ملتی ہے جو اپنے خاندانی دستور کے تحت چوڑیاں خود خرید کر نہیں پہن سکتی۔ چوڑیوں کے لئے ترس رہی ہے۔ ایسی کنواری بھی ملتی ہے جو دلہن بننے کے حسین خواب پلکوں پر سجائے وقت بتا رہی ہے۔ ایسی بیوی بھی موجود ہے جس کے شوہر کی ایک ٹانگ بارود کا گولہ نگل چکا ہے اور اب وہ اس کرب میں مبتلا ہے کہ اسے ساری زندگی شوہر کا صرف ایک جوتا پالش کرنا ہوگا۔

اور ایسی لڑکی بھی ملتی ہے جو حجرے سے پرائے مردوں کے استعمال ہونے والے بستروں اور تکیوں کے لمس سے اپنی جوانی کی پیاس بجھاتی ہے۔ ایسی بہن بھی نظر آئے گی جو جوان بھائی کی موت کا روگ پالتی ہے۔ ایسے نوجوان بھی ان افسانوں کے کردار ہیں جو چوکھٹ سے کانچ کی چوڑیوں کی کرچیوں سے اپنی تسکین کا سامان کرتے ہیں۔ ظریف ایسا ہی ایک کردار ہے۔ یہ اور ایسے دوسرے بہت سے کردار ہیں جن کے ذریعہ بانو کے افسانوں اور بطور خاص عورت کی بے بسی اور مجبوری کی داستانیں سنانے کی کوشش کی ہے وہ ہمیں بتانا چاہتی ہیں کہ آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے۔ اور عورت بھی ایک انسان ہے اسے بھی یہ حق حاصل ہونا چاہیے عورت اگر غلام ہے تو وہ '' آزاد'' نسل کو کیسے جنم دے سکتی ہے؟؟

کم و بیش بانو کے تمام افسانے اسی نقطۂ نظر کے گرد گھومتے ہیں کہ وہ مرد کے ساتھ عورت کے لئے بھی جینے کا حق مانگتی ہیں وہ عورت کو بھی اشرف المخلوقات کا درجہ دلانا چاہتی ہیں۔

'' پگلی'' زیتون بانو کا ایک ایسا پشتو افسانہ ہے جو ایک ان پڑھ پختون عورت کے احساسات و جذبات پر مبنی ہے۔ یہ عورت جو پاگل سمجھی گئی ہے۔ کیا محسوس کرتی ہے؟ اس کی بے چارگی، کرب اور گھٹن اس افسانے کا محور ہے۔ شمشو اپنے سسرالیوں کی ستائی ہوئی عورت، جس کا شوہر ایک پڑھی لکھی عورت کو اس کی سوتن بنالیتا ہے اور بالآخر شمشو اپنے ہوش و حواس کھو دیتی ہے اور دیوانی ہو جاتی ہے کہ ایک پڑھی لکھی

عورت نے ان پڑھ شعو کے عورت پنے کو شکست دی تھی۔

''شیشم کا پتا'' بانو کا شاید سب سے نمایاں افسانہ ہے۔ یہ بھی عورت کی ذات کے ایک المیاتی رخ کو سامنے لاتا ہے۔ ایک روایتی ماحول میں رہنے والی کنواری لڑکی جو نوجوانی کی دہلیز پار کر کے اب بڑھاپے کی چوکھٹ کو چھو رہی ہے۔ اپنی جنسی تسکین کا کیا غیر فطری طریقہ ڈھونڈ نکالتی ہے۔ یہ اس کی بے بسی اور محرومی کا احساس ہے کہ نہیں؟ کیونکہ ایسے روایتی معاشرے میں غیرت یا جائیداد بچانے کے لئے عورت کو بعض اوقات اس فطری حق سے بھی محروم رکھا جاتا ہے۔

زیتون بانو صاحبہ عورت کے المیوں کے ساتھ ساتھ اس کے آدرشوں، امنگوں اور آرزوؤں کی بھی بات کرتی ہیں۔ ان کا ایک افسانہ ''پہچان'' ایسا ہی ایک افسانہ ہے۔ اس کا مرکزی کردار شمع جسے منحوس قرار دیا جاتا ہے یہ اس الزام کو دور کرنے کے واسطے زندگی کی کٹھن منزلوں کو سر کرتی ہے اور اپنی قسمت خود بدل دیتی ہے۔ یہ اور اس نوع کی بے شمار کہانیاں بانو ہمیں سناتی ہیں۔ یوں لگتا ہے یہ ان کی شعوری کوشش ہے۔ وہ ایسا اس لئے کرتی ہیں تاکہ آج کی عورت اپنے پیروں پر آپ کھڑی ہو سکے۔ اپنے حق کے لئے آواز اٹھا سکے۔ اپنے ہونے کا احساس دلانے کے لئے لڑ سکے۔ معاشرے میں اپنا کردار ادا کرنے کے قابل بن سکے۔ اور منوا سکے کہ وہ مرد کے پیروں کا جوتا ہے اور نہ ہی پرائے گھر کا کوڑا کرکٹ ہے۔

میرمن زیتون بانو عورت کو تاریک راہوں سے نکلنے کا پیغام دینے کے ساتھ ساتھ زندگی کا راستہ بھی دکھاتی ہیں۔ روشنی اور اجالوں کا راستہ، خوشی اور کامیابی کا راستہ، انسانیت اور محبت کا راستہ، نئے عہد کا راستہ، برابری کا راستہ، اور حقوق کا راستہ۔ کہ یہی تو ایک انسانیت دوست قلمکار کا فریضہ ہے۔

ڈاکٹر سلمیٰ شاہین بانو صاحبہ کے اسی وصف اور خوبی کو سراہتے ہوئے لکھتی ہیں۔

''بانو پشتون ثقافت کی ترجمان اور پشتون عورت کے جذبات کی عکاس ہیں۔ ایک طرف اگر ان کو پشتون اقدار کی پاسداری کا پاس ہے تو دوسری طرف بڑی بے خوفی اور بے جگری سے اپنے قلم کی نوک سے ان کجرویوں کو پاش پاش کرنے کی سعی بھی کرتی ہیں۔ زندگی کے آئینے میں پشتونوں کو ان کا اصلی چہرہ دکھانے سے ذرا بھی نہیں چوکتیں۔۔۔ مظالم، زیادتیاں، جبر، جن کے خلاف آج کل Women Movement کے نام سے تحاریک چل رہی ہیں اور انہیں بجا طور پر اور بلا تردید Women Movement کی محرک سمجھا جاتا

میرے نزدیک ایک جائز حقیقت سے کم نہیں۔"

میرمن بانو نے عورت کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ پختون روایات کی عکاسی بھی کی ہے۔انہوں نے
جہاں اس معاشرے کے منفی عناصر کو بے نقاب کیا وہاں اس معاشرے کے مثبت پہلو بھی اجاگر کئے۔
عام طور پر سرحد اور اہل سرحد کو ایک سخت مزاج، کرخت، نیم وحشی، جاہل اور جابر علاقہ تصور کیا جاتا ہے
مگر بانو اور بانو جیسے دوسرے اہل قلم نے ملک بھر میں اس تاثر کو زائل کرنے کے لئے پختونوں کے
مثبت کردار کو روشناس کرانے کی کوششیں جاری رکھی ہوئی ہیں۔بانو کا بھی اس مہم میں نمایاں کردار بنتا ہے
(مرحوم) منصور قیصر صاحب اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"یہ کریڈٹ پختون اہل قلم کو جاتا ہے جنہوں نے نہ صرف پشتونوں کے بارے میں سامراج اور سامراج کے حاشیہ برداروں کے قائم شدہ مکروہ اور بھیانک تصورات کو تحلیل کیا بلکہ ان کے ذوق کمال، ان کے حسن کردار، ان کی عظمت احساس، ان کے ارفع جذبے اور ان کی مہمان نوازی کو بڑے بھرپور انداز میں اجاگر کیا۔اس طرح سرحد کے ان اہل قلم نے دوہرا کردار ادا کیا ہے۔ایک طرف تو انہوں نے اپنی معاشرتی صورت حال کی عکاسی کی اور دوسری طرف پشتو زبان سے نابلد قارئین کو پختون روایات اور سماجی رویوں سے متعارف کروایا۔"

نامور ادیب فارغ بخاری مرحوم محترمہ بانو کی اس افسانوی خوبی کی بابت لکھتے ہیں۔

"عورت کی محرومیاں زیتون بانو کی ترجیحات میں ایک خاص مقام پاتی ہیں۔یہ محرومیاں معاشرے میں مختلف صورتوں میں بکھری ملتی ہیں۔کبھی تعلیم سے محرومی کی شکل میں، کبھی باپ کی وراثت سے محرومی کی شکل میں۔سرحد کے دیہات کی معاشرت کا جس قدر گہرا مشاہدہ اور جس قدر حقیقت پسندانہ عکاسی ہمیں زیتون بانو کی کہانیوں میں ملتی ہے وہ اس کے کسی دوسرے ہم عصر کہانی کار کے ہاں ملنی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔"

جناب طارق شاہد نے میرمن زیتون بانو سے ایک انٹرویو کے دوران سوال کیا تھا کہ آپ کی تخلیقات کا
بنیادی محور کیا ہے؟ تو بانو صاحبہ کا جواب تھا "الحمدللہ!! میں اپنی پیدائش سے بھی بہت پہلے سے ایک ایسی
آگ سے نمو پا رہی ہوں جو تابناک ہے اور اس کی حرارت سے مجھے زندگی عطا ہو رہی ہے۔اور میں زندہ

ہوں کہ میری ماں اور میری ماں کی ماں اور پھر اس کی ماں اور اس کی ماں کی ماں بھی اسی آگ کی حدت میں جلتی رہیں۔ اپنے اپنے زمانوں میں اپنی اپنی زندگیوں کی تگ ودو میں مر مٹ جاتیں، خاکستر ہو جاتیں۔ مگر میں نے کہا نا کہ میں زندہ ہوں؟ انہیں کیوں مرنے دیتی؟ میں اس اندر والی آگ میں جو عورت کا مقدر سمجھی گئی تھی انہیں کیسے جلنے دیتی! کیسے خاک میں رلنے دیتی۔ میں تو بلکہ اس آگ سے نمو پا رہی ہوں اور گئے زمانوں کی اور اس موجودہ دور کی اور جب تک یہ دھرتی سلامت ہے تو زمین کے اپنے محور پر گردش سے بننے والے وقتوں کی ماؤں کے تقدس کو دوام بخشنے کی کوششوں میں مصروف عمل ہوں۔ یہی میرے قلم کا جہاد ہے اور یہی میری تخلیقات کا بنیادی محور بھی۔

حقیقت پسندی :

میر من زیتون بانو اپنے قاری کو تخیلاتی اور تصوراتی دنیاؤں کی سیر نہیں کراتیں۔ اور شاید ان کے قلم کی سب سے بڑی اور نمایاں خصوصیت یہی ہے۔ وہ مدہوشی کی میٹھی اور نشہ آور گولی کھلا کر حقیقت کی دنیا سے دور نہیں لے جاتیں۔ ٹھوس آہنی حقائق کی بات کرتی ہیں۔ یہ حقائق تلخ سہی، بے مہر سہی اور سفاک سہی مگر بہرکیف یہ وہ حقائق ہیں جو ہمیں دنیا سے آنکھیں ملانے کے قابل بناتے ہیں۔

معروف شاعر پروفیسر محسن احسان نے اباسین آرٹس کونسل کی ایک تقریب میں بانو صاحبہ کی افسانہ نگاری کے حوالے سے کہا تھا۔

> ''زیتون بانو اس حقیقت پسندانہ رویئے کے علم برداروں میں سے ایک ہے جو انسانی جذبات، کیفیات، حالات، واقعات اور فکری احساس کو اس کے اصلی روپ میں پیش کرنے کا فن جانتے ہیں۔ بانو کی حقیقت پسندی اکثر اوقات کہانی کے حسن کو متاثر بھی کرتی ہے اور اس کی دلکشی میں اضافے کا سبب بھی بنتی ہے۔''

دراصل خود بانو کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ادیب کا یہ کام نہیں کہ وہ قاری کو حقیقت کی دنیا سے دور کردے بلکہ ادب اور ادیب کا فرض عین ہے کہ وہ حقیقت کا سامنا کرنا سکھائے۔ کیونکہ بانو کے خیال میں جھوٹا افسانہ گھڑنا قاری کو نشے والی گولی کھلا کر دھوکہ دینے کے مترادف ہے اسی لئے بانو سچی بات کرتی ہیں چاہے یہ سچ کتنا ہی کڑوا کیوں نہ ہو۔

سچ بات یہ ہے کہ زیتون بانو کے اندر بچپن سے ہی ایک ایسا سچ پل رہا تھا جو کبھی کونین کا سا کڑوا ہوجاتا تھا تو کبھی شہد کی سی مٹھاس سے اس کی روح تک کو طمانیت مل جاتی۔ جب کوئی لغزش اس سے سرزد ہو جاتی تو ''مورجان'' یا ''داجی'' کی باز پرس پر وہی اندر کا سچ ابل پڑتا اور وہ فوراً اپنا قصور مان جاتی۔

مائیں بہت مہربان ہوتی ہیں مگر کبھی کبھار بچوں پر ایسا ظلم بھی ڈھا جاتی ہیں کہ دنوں بچوں کو نہیں بھولتا۔ اکثر اپنا قصور مان کر بھی ماں کی سزا سے بچنا ممکن نہ تھا۔ داجی کا رویہ مختلف تھا وہ قصور ماننے پر خوش ہو جاتے۔ مگر باپ ہونے کے ناطے ذرا سی تنبیہ بھی کر جاتے۔ ''آئندہ خیال رکھنا۔''!!

اور جب سچ کا یہ بیج پک کر نمو پا گیا اور بالیدگی کے قابل ہوا تو بانو کے قلم نے اس سچ کا دامن تھاما۔ سکول کی لاابالی عمر ہی سے ''ھنداره'' (آئینہ) کی کہانیاں لکھ کر اپنی گزری نسل کو آئینہ دکھایا اور آنے والی نسل کے لئے مشعل جلا گئیں۔

بقول ناصر علی سید:

آنے والی نسل پر احسان ناصرؔ یہ کیا
سچ بزرگوں سے نہ پایا لیکن ان کو دے دیا

بانو نے ایک موقع پر کہا تھا۔۔۔

''میں جھوٹ اس لئے نہیں بول سکتی کہ میری یادداشت بہت کمزور ہے اپنی کہی ہوئی جھوٹی بات بھول بھی سکتی ہوں۔ سچ انسان کو یاد رہتا ہے۔ جس کا حافظہ تیز ہو جھوٹ بولنا اسی کو راس آسکتا ہے۔''

محترمہ زیتون بانو کی حقیقت نگاری نے ان کو افسانے کے میدان میں ملک گیر شہرت دلائی۔ ورنہ ان سے پہلے ہم دیکھتے ہیں کہ سوائے چند ایک کے پشتو افسانے پر ایک مریضانہ رومانویت کی فضا طاری تھی جس نے افسانے کے منظر نامے کو بوجھل بنا دیا تھا۔ پشتو کے وہ منظوم افسانے جو تاریخی واقعیت کے لحاظ سے اہمیت رکھتے تھے نئے عہد کے تقاضوں پر پورے اترنے کے قابل نہ رہے تھے۔ افسانہ کردار نگاری کے حوالے سے بالخصوص اور دیگر حوالوں سے بالعموم حقیقت پرستی اور حقیقت نگاری کا متقاضی ہوتا ہے مگر ہمارے افسانہ نگاروں نے زندگی سے فرار حاصل کرنے کے لئے رومان پرور فضاؤں کا رخ کیا اور افسانے کو طلسمات اور شعبدہ بازی کا میدان بنا دیا تھا اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس بیمار اور مریضانہ انداز کے

خلاف پہلی اور بھرپور بغاوت میر من زیتون بانو کرتی ہیں ۔محترمہ بانو نے پشتو افسانے کو زندگی کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ کرایا اور اسے سماجی زندگی کی عکاسی کا ذریعہ بنادیا۔

اس حوالے سے زیتون بانو صاحبہ وہ واحد افسانہ نویس ہیں جنہوں نے افسانے میں ایک جاندار، منفرد اور مقبول طرز کی بنیاد ڈالی ۔پشتو افسانے کو حقیقت نگاری کا جو راستہ بانو صاحبہ نے دکھلایا تھا ہم دیکھتے ہیں کہ بعد میں آنے والے افسانہ نگاروں نے اسی راستے پر چل کر حقیقت نگاری کی ایک پوری تحریک کی صورت اپنالی اور بلاشبہ اس کا سہرا میر من بانو کے سر ہے۔

بانو کی اس حقیقت پسندی کا اعتراف ڈاکٹر سلمٰی شاہین بے حد خوبصورت اور دوٹوک انداز میں کرتی ہیں ۔وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتی ہیں ۔

> ''بانو زندگی کو حقیقت کی نظر سے دیکھتی ہے اور حقیقت کو بھی حقیقت کی نظر سے دیکھتی ہے ۔بانو کے افسانے فصلیں، چاپچی، دلشادہ، زنزیرونہ (زنجیریں)، وینو خوڑے دیوال (کرم خوردہ ستون)، مات بنگڑی (کانچ کے ٹکڑے)، ڈالئے (تحفہ)، دشوے پانڑہ (شیشم کا پتا) یہ سارے افسانے اس حقیقت کے گواہ ہیں کہ یہ افسانے نہیں سچ ہیں ۔اور ان سے چشم پوشی ممکن نہیں ۔''

غرض یہ اور ان جیسی بے شمار خوبیاں بانو کے افسانے کو وہ فنی پختگی اور خوبصورتی عطا کر دیتی ہیں جن کے باعث وہ صف اول کے افسانہ نگاروں کی فہرست میں جگہ پاتی ہیں اور ان کے بارے میں ایک معروف نقاد کا یہ کہنا درست ثابت ہوتا ہے کہ

> ''بانو نے افسانہ نگاری کے اصولوں کو بڑی خوبصورتی سے نبھایا ہے۔سستے اور بازاری واقعات وخیالات سے دامن بچا کر، خیالات وافکار کی اس دنیا میں پہنچ گئی ہے جہاں فن کا مقصد صرف نام ونمود نہیں ہوتا بلکہ اس کے ذریعے انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اعلیٰ اقدار کا حامل بنایا جاتا ہے ۔انسان کو اس کی اپنی حقیقت واہمیت سے روشناس کرایا جاتا ہے ۔یہ بات بلا خوف وتردید کہی جاسکتی ہے کہ پشتو افسانے کو ایک مستحکم اور پائیدار بنیاد عطا کرنے والے فنکاروں میں بانو کا نام سر فہرست ہے۔''

بانو کی کتابیں

پشتو کتابیں

1۔	هنداره (آئینہ)	1958	پشتو ڈرامے + افسانے
2۔	مات بنګړی (کانچ کے ٹکڑے)	1959, 1961	پشتو افسانے (دو بار چھپی)
3۔	ژوندی غمونه (زندہ دکھ)	1979,1971,2004	پشتو افسانے (تین بار چھپی)
4۔	کچکول (کشکول)	1991	ریڈیو، ٹی وی ڈرامے
5۔	خوبونه (خواب)	1972	پشتو افسانے
6۔	نیزه ورے (سیلابی تنکا)	2008	پشتو افسانے
7۔	زما دائری (میری ڈائری)	2008	پشتو افسانے
8۔	منجیله	2006	پشتو شاعری

اردو کتابیں

1۔	شیشم کا پتا	1976	اردو افسانے (تراجم)
2۔	وقت کی دہلیز پر	1980	اردو افسانے (تراجم)
3۔	زندہ دکھ	1998	اردو افسانے (تراجم)
4۔	برگ آرزو	1994	اردو ناولٹ (طبع زاد)
5۔	برگد کا سایہ	1997	اردو افسانے (طبع زاد)

زیتون بانو کا ادبی سفر جو باقاعدہ طور پر 1958ء سے شروع ہوتا ہے۔تب سے اب تک ان کے کئی پشتو اور اردو افسانوی مجموعے، ڈرامے، شاعری اور دیگر کتب شائع ہو چکی ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ان کے حساس اور فنکارانہ مزاج اور فطرت کی جولانی انہیں کچھ نہ کچھ لکھنے پہ اکساتی رہتی ہے اور

حالات اور موقع کی مناسبت سے یہ تحریریں شائع ہو کر اہل ذوق کی داد و تحسین کا مرکز بنتی رہتی ہیں۔
ذیل میں باتو کے ادبی سفر کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا جا رہا ہے جس میں ان کی کتب کی تفصیل اور تعارف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

1۔ هنداره (1958)

''هنداره'' زیتون بانو کی پہلی ادبی تخلیق ہے۔ یہ کتاب 1958ء میں ادارہ اشاعت سرحد، قصہ خوانی پشاور نے شائع کی۔ اس میں کل 12 افسانے اور دو ڈرامے شامل ہیں۔

1۔	خړه لفافه (خاکی لفافہ)	ڈرامہ
2۔	کرم شوک دی (قصوروار کون)	ڈرامہ
3۔	شاعر	افسانہ
4۔	تانگے والا (کوچوان)	افسانہ
5۔	لیونئی (پگلی)	افسانہ
6۔	تصویر	افسانہ
7۔	گونګی پیریان (گونگے جن)	افسانہ
8۔	تیلے (تیلی)	افسانہ
9۔	دلشاده (دلشاد)	افسانہ
10۔	دخلوپل (تنکوکا پل)	افسانہ
11۔	سترګې (آنکھیں)	افسانہ
12۔	چپې (لہریں)	افسانہ
13۔	د بیزو قبر (بندر کی قبر)	افسانہ
14۔	لاس (ہاتھ)	افسانہ

اس کتاب کا پیش لفظ عبدالخالق خلیق مرحوم نے لکھا تھا اور انہوں نے جس طرح پیش لفظ میں ہی ذکر کر دیا تھا کہ ایک پشتون عورت کی اس کاوش کو باغیانہ اقدام سمجھتے ہوئے بھی بہت پسند کیا جائے گا۔ بعد میں ان کی یہ پیش گوئی واقعی سچ ثابت ہوئی اور بلا شبہ یہ کتاب زیتون باتو کے ادبی سفر کا ہی نہیں ہر پشتون لکھاری بالخصوص خواتین لکھاریوں کے لئے بھی ایک مثال اور سنگ میل کی حیثیت اختیار کر گئی۔ اگر چہ یہ

باؔنو کا پہلا افسانوی مجموعہ تھا مگر صداقت اور پختگی کے ضمن میں ایک اچھی کاوش تھی اور بانو کی افسانہ نگاری کی بنیاد کے طور پر ان کی پہچان کا ذریعہ بھی، یوں تو کتاب میں موجود تمام ادب پارے معیاری تصور کیے جاسکتے ہیں۔ مگر چند ایک افسانے بے حد مشہور ہوئے جن میں ''تانگے والا''، ''گونگے جن''، ''دلشادہ'' وغیرہ شامل ہیں۔ ان افسانوں کو بلاشبہ بڑے افسانوں میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

2۔ مات بنگری (کانچ کے ٹکڑے) 1959ء

محترمہ باؔنو کا دوسرا پشتو افسانوی مجموعہ'' مات بنگری '' کے نام سے 1959ء میں سامنے آیا۔ اس کتاب کی نشر و اشاعت کا سہرا مکتبہ ارژنگ پشاور کے سر ہے۔ یہ کتاب باؔنو کی پہلی کتاب کے تقریباً ایک سال بعد شائع ہوئی مگر فنی پختگی اور معیار کے حوالے سے لگتا ہے جیسے یہ ایک برس کا نہیں بلکہ صدیوں کا سفر تھا جس میں بانو کی افسانہ نگاری مزید نکھرتی اور پختہ ہوتی چلی گئی۔ کتاب کا پیش لفظ معروف ادیب اور نقاد جناب ایوب صاؔبر نے لکھا۔ انہوں نے باؔنو کے فن کا بے حد جامع انداز میں احاطہ کیا ہے اور باؔنو کے افسانوں کو افسانہ نگاری کے فن کی معیاری کوششوں میں شامل کیا ہے۔

اس کتاب میں بھی بارہ (12) افسانے شامل ہیں اور سب منفرد اور کامیاب ہیں۔

1۔ بخت (نصیب، قسمت)
2۔ نتکئی (نتھ)
3۔ نیم لاس (آدھا ہاتھ)
4۔ نشانئی (نشئی)
5۔ ببوزے (دستی پنکھا)
6۔ انتقام
7۔ اغہ دغہ (اول فول)
8۔ صالئی (صوالئی)
9۔ پولنگ ستیشن (پولنگ اسٹیشن)
10۔ وھم (وہم)
11۔ مات بنگری (کانچ کے ٹکڑے)
12۔ دالئی (تحفہ)

''مات ہنگری'' بانو کی ایک خوبصورت کاوش ہے اس میں موجود افسانے پشتون معاشرت کی عکاسی کی بہترین مثال ہیں۔ پشتون روایات اور رسم ورواج نیز پشتون عورت کے احساسات، جذبات اور حالات کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔

کتاب میں موجود کچھ افسانے تو اس معیار کے ہیں جنہیں پڑھ کر قاری دم بخود رہ جاتا ہے۔ سچے مگر تلخ حقائق کی ایسی عکاسی کی گئی ہے کہ پڑھنے والے کو حیرت بھی ہوتی ہے۔ سادہ سادہ سے عام فہم ہلکے پھلکے انداز میں ایسی ایسی سچائیاں بیان کی گئی ہیں کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ کتاب میں موجود ایک افسانہ ''بوزے'' (دستی پنکھا) ایک بے حد خوبصورت افسانہ ہے۔ جو نہایت سادہ انداز میں ابلاغ کا حق ادا کرتا ہے ایک اور افسانہ ''انتقام'' بھی بہت موثر تحریر ہے ان کے علاوہ ''صالئی''، ''نشائی'' وغیرہ بھی معیاری افسانے ہیں۔ خاص طور پر کتاب کا عنوان بننے والا افسانہ ''مات ہنگری'' (کانچ کے ٹکڑے) بھی قابل ذکر ہے۔ جس میں ایک جوان لڑکے کی نفسیات بڑے ہی پرکار انداز میں پیش ہوئے ہیں۔

3۔ شیشم کا پتا (اردو افسانوی مجوعہ)

اپنے ادبی سفر کے آغاز میں بانو پشتو زبان کو ہی ذریعہ اظہار بناتی رہیں۔ مگر کامیاب پشتو تصانیف سے ملنے والے حوصلے اور چند خیر خواہ دوستوں اور عزیزوں کے مشورے اور تعاون کی یقین دہانی کے نتیجے میں بانو نے اپنے دائرہ اثر کو وسیع کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے اپنے پشتو افسانوں کا اردو میں ترجمہ کرنے کا قدم اٹھایا۔ ان کی کتاب ''شیشم کا پتا'' اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ یہ کتاب 1979ء میں شائع ہوئی۔

لگتا ہے بارہ (12) کا عدد بانو کا مبارک ہندسہ ہے۔ کیونکہ ان کی ہر کتاب میں اتنے ہی ادب پارے موجود ہوتے ہیں۔

(**نوٹ**: اور 12 اپریل کو ہی ان کی تعیناتی پروڈیوسر کی حیثیت سے ریڈیو پاکستان میں ہوئی تھی۔)

''شیشم کا پتا'' کتاب بھی مکتبہ ارژنگ پشاور سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں شامل افسانے بانو کے پشتو افسانوں کے تراجم ہیں۔ اس سے پہلے یہ افسانے متفرق رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے تھے جن میں ''استقلال''، ''نگارش''، ''نقش''، ''لیل ونہار''، ''گمرانہ'' (برمنگھم)، ''حکایت''، ''خواتین ڈائجسٹ''، ''سورج''، ''احساس''، ''سیارہ ڈائجسٹ''، ''قند''، ''روبی'' (انڈیا) ''بیسویں صدی'' (انڈیا)، ''انشاء'' (کلکتہ انڈیا) وغیرہ شامل ہیں۔ کتاب میں موجود پانچ افسانوں کا ترجمہ بانو کے شوہر تاج سعید نے کیا

تھا جو درج ذیل ہیں۔

1۔ بختاور

2۔ دوشیزگی کی نشانی

3۔ کانچ کے ٹکڑے

4۔ ناتمام آرزو

5۔ کرم خوردہ ستون

تین افسانوں کا اردو ترجمہ فقیر حسین ساحر (مرحوم) نے کیا۔

6۔ سردار

7۔ پنچھی

8۔ تماشا تماشائی

دو افسانوں کا ترجمہ رحیم گل (مرحوم) نے کیا

9۔ موم کے آنسو

10۔ شیشم کا پتا

ایک افسانے کا ترجمہ جناب خاطر غزنوی نے کیا

11۔ زندہ دکھ

اور ایک افسانے کا ترجمہ جناب سعد اللہ جان برق نے کیا ہے۔

12۔ ایک آنے کا بیٹا

کتاب میں موجود یوں تو سبھی تراجم اپنی مثال آپ ہیں مگر سب سے مؤثر رحیم گل کے ترجمہ شدہ افسانے ''موم کے آنسو'' اور ''شیشم کا پتا'' ہیں۔ بالخصوص ''شیشم کا پتا'' کو جس معیار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ وہ اپنی مثال آپ ہے اور یقیناً اس میں جتنا ہاتھ بانو کے فن اور فکر کا ہے۔ اتنا ہی رحیم گل کے خوبصورت ترجمے کا بھی ہے۔

نوٹ :(''مات بنگڑی'' کا ترجمہ ''کانچ کے ٹکڑے'' کے نام سے رحیم گل نے بھی کیا تھا اور ''گھرانہ'' جو برمنگھم (انگلینڈ) سے شائع ہوتا تھا اس رسالے میں پہلی بار چھپا تھا)

''شیشم کا پتا'' میرمن بانو کی وہ کاوش ہے جس کے بعد ان کا نام ادب کے میدان میں قومی سطح پر لیا جانے لگا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس کتاب کو بہت پذیرائی ملی۔ اور اگلے دو تین برسوں میں ملکی سطح پر تقاریب کا

انعقاد ہوتا رہا اور ارباب علم وفن نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کرنے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔

کتاب کی اشاعت کا فائدہ یہ ہوا کہ پورا ملک پشتون معاشرت اور روایات سے آگاہ ہونے لگا یوں سرحد جیسے روایتی معاشرے کو پورے ملک سے متعارف کرانے کا حق ادا ہو گیا اس لئے اس کتاب اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے اور اس بات کا اظہار کتاب کے پیش لفظ میں اعجاز راہی نے بھی کیا ہے۔

4۔ ژوندی غمونہ (زندہ دکھ) (1958,1979)

میر من بانو کی اس کتاب کے اب تک تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا ایڈیشن 1979ء میں، دوسرا 1985ء میں سامنے آیا۔ اس کا ناشر بھی مکتبہ ارژنگ پشاور ہے۔ تیسرا ایڈیشن یونیورسٹی بک ایجنسی نے شائع کیا۔ پشتو افسانوں پر مبنی اس کتاب میں بھی بارہ (12) افسانے شامل ہیں۔ جن کے نام ہیں۔

1۔ دخاورې ځلې (مٹی کا ڈھیر)
2۔ دسولئی پہ سر (سر دار)
3۔ مات لاس (ٹوٹا ہاتھ)
4۔ زنځیرونہ (زنجیریں)
5۔ وینو خوړلے دیوال (کرم خوردہ ستون)
6۔ ارمان
7۔ ژوندی غمونہ (زندہ دکھ)
8۔ زہ کونډہ نہ ئیمہ (میں بیوہ نہیں ہوں)
9۔ سوغات
10۔ دشوې پانړہ (شیشم کا پتا)
11۔ کخې (فصل کا رکھوالا)
12۔ چلمچی

ایک اہم بات جو اس میں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس دور میں پہنچ کر بانو کی افسانہ نگاری کی درجہ بندی ہو گئی ہے اور ان کی تحریر میں ایک ایسی پختگی کا احساس ہوتا ہے جو شاید اس سے پہلے کے افسانوں میں زیادہ نہ ہو۔ یوں تو تمام افسانے اپنی مثال آپ ہیں۔ ایک لا جواب اور معنی خیز اور معنی آفرین افسانہ ''کخې'' ہے جو کتاب کا حاصل سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ افسانہ ایک ایسی معاشرتی حقیقت کا اظہار

ے، جو رونگھٹے کھڑے کر دیتی ہے شاید اس موضوع پر برصغیر کے ادب میں بہت کچھ لکھا گیا ہوگا اور
بنا لکھا گیا ہے مگر ایک پشتون معاشرے کی پشتون لکھاری اور وہ بھی عورت کے قلم سے تراشے
ئے اس بیانیہ پیکر نے بے شمار دلوں کو دھڑکا لگایا ہوگا۔ اس افسانے میں وہ معنویت ہے جو ایک
سچے اور سچے فنکار کا قلم ہی پیدا کرسکتا ہے۔
"کچے" کے علاوہ بھی بہت سے افسانے کتاب کی زینت بڑھانے میں ممد ومعاون ہیں۔ "چلیچی"،
یئو خوړلے دیوال "(کرم خوردہ ستون)" ژوندی غمونہ "(زندہ دکھ) وغیرہ۔

5۔ کچکول (کشکول) 1991ء

ڈراموں پر مبنی یہ کتاب 1991ء میں شائع ہوئی یہ ٹیلی وژن اور ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ یہ
ن مکتبہ ارژنگ پشاور سے شائع ہوئی اس میں کل چھ ڈرامے شامل ہیں۔

1۔ دنخترونه (صنوبر کا درخت)
2۔ دونیم مخ (دوسرا چہرہ)
3۔ پرزه
4۔ دبنړ سوبرے (برگد کا سایہ)
5۔ تیک (بندی)
6۔ دخاورې ځلے (مٹی کا ڈھیر)

اس کتاب کی اشاعت سے ثابت ہوجاتا ہے کہ باتو ایک اچھی افسانہ نگار ہی نہیں ایک کامیاب ڈرامہ
نویس بھی ہیں اور وہ فن ڈرامہ نگاری کے رموز سے بخوبی واقفیت اور آگاہی بھی رکھتی ہیں اور انہیں برتنے
ہنر بھی خوب جانتی ہیں۔ دراصل باتو ایک طویل عرصے تک ریڈیو سے منسلک رہی ہیں اور ریڈیو
اے کی ضروریات ولوازمات سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ اسی لئے وہ اپنی اس کوشش میں بھی کامیاب
ر آتی ہیں۔ اس کتاب میں موجود ڈراموں کے کردار نہایت پختہ اور حقیقی ہیں۔ کیونکہ باتو نے ان کی
تخلیق میں پوری فنکارانہ ایمانداری کا ثبوت دیا ہے۔

6۔ "وقت کی دھلیز پر" 1982ء

یہ کتاب بھی باتو کے پشتو افسانوں کے اردو تراجموں پر مبنی ہے۔ مترجمین میں فقیر حسین ساحر اور مشتاق

شباب کے نام شامل ہیں۔ کتاب 1982ء میں سنگ میل پبلیکیشنز لاہور نے شائع کی ہے اور اس میں کل چودہ (14) افسانے شامل ہیں۔ جن میں نو (9) افسانوں کا ترجمہ مشتاق شباب نے کیا ہے۔ افسانے درج ذیل عنوانات کے تحت تحریر کئے گئے ہیں۔

1۔ پہچان
2۔ آنکھیں
3۔ فصیلیں
4۔ خودفریبی
5۔ کاغذار
6۔ وقت کی دہلیز پر
7۔ بندر کی قبر
8۔ گونگے جن
9۔ امانت
10۔ چاہت اپنے لئے
11۔ نشہ
12۔ خوشگوار لمحوں کا افسانہ
13۔ صوالئے
14۔ پگلی

7۔ خوبونہ 1984ء

بانو کی یہ کتاب (خواب) 1984ء میں مکتبہ ارژنگ پشاور سے چھپی۔ یہ بھی افسانوں پرمنی ہے اور اس میں سولہ (16) افسانے شامل ہیں۔ کتاب کے آغاز میں ڈاکٹر ضیال بخاری اور پروفیسر محمد نواز طائر نے اپنی آرا کا اظہار کیا ہے اور بانو کی افسانہ نگاری کی خصوصیات کا ذکر ہوا ہے۔ "خوبونہ" کتاب اکادمی ادبیات اسلام آباد کا ہجرہ ایوارڈ حاصل کر چکی ہے۔ کتاب میں موجود افسانوں کے عنوانات درج ذیل ہیں۔

1۔ گوت بہر (ٹکڑ)
2۔ فنکارہ

3- بھتیے (بوجھ)

4- میرانہ (جوانمردی)

5- الوت (اُڑان)

6- کوترہ (کبوتری)

7- منزل

8- خاورې (مٹی)

9- گونگئی (گونگی)

10- گنگھرے (کائی)

11- خوبونہ (خواب)

12- موتئی (دستہ)

13- رنڑا (اجالا)

14- شپول (باڑھ)

15- یوہوئیے چیت (اک تھوڑی سی روشنی)

16- داوسپنې جنبې (لوہے کے چنے)

8- برگ آرزو 1994ء

نفسیاتی الجھنوں پر مبنی یہ کتاب 1994ء میں سنگ میل پبلیکیشنز نے شائع کی ہے اور پشاور ٹی وی سنٹر سے ''ڈھول'' کے نام سے سات قسطوں پر مشتمل منی سیریئل کی شکل میں ٹیلی کاسٹ ہوا ہے اور ناظرین کی داد بھی حاصل کر چکا ہے اس میں بانو نے ایک لے پالک کی نفسیاتی الجھن کی سچی اور حقیقی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے کتاب کے آغاز میں احمد سلیم صاحب، بانو کی فنکاری کا اقرار کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

> ''ڈھول'' واقعات کا نہیں واردات کا نام ہے اس میں کہانی تو ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ حقیقی زندگی کی تصویریں بھی ہیں۔ان تصویروں میں فوٹو جیسی ہو بہو نقالی نہیں ہے بلکہ ایسا ہے کہ ان پر حقیقت کا گمان گزرتا ہے''۔5

دراصل یہ ایک پشتون لڑکی کی کہانی ہے۔''زیبو'' فرسودہ اور بے معنی روایات سے بغاوت کرنے

والی ایک انقلابی انسان بننے کی کوشش کرتی ہے مگر پھر سے بزعم خود ان ہی دھاگوں میں اپنے آپ کو پھنسا کر الجھا لیتی ہے جن کو وہ ساری عمر سلجھانے کی کوشش کرتی رہی ہے اور اسی شخص (رفیق) کا انتظار کرنے لگتی ہے جو اس کا چچازاد ہے۔ جس سے وہ ساری عمر نفرت کرتی رہی ہے اور جو جیل میں ہے اور لمبی قید کی سزا کاٹ رہا ہے۔

9۔ زندہ دکھ 1998ء

''شیشم کا پتا'' اور ''وقت کی دہلیز پر'' میں شامل افسانوں کو اکٹھا کر کے ''زندہ دکھ'' کے نام سے 1998ء میں یہ کتاب مقبول اکیڈیمی لاہور نے شائع کی ہے۔ اس میں کل ملا کر چھبیس (26) افسانے شامل ہیں۔ کتاب کی اہم بات یہ ہے کہ کتاب کے آغاز میں موجود ایوب صابر کے پیش لفظ میں بانو کو پشتو افسانے کی خاتون اوّل کا نام دیا گیا ہے جو واقعی ایک حقیقت ہے اور باؔنو سے یہ اعزاز کبھی بھی نہیں چھینا جا سکتا۔ اس پیش لفظ میں ایوب صابر صاحب نے صرف باؔنو کے فن پر ہی بات نہیں کی بلکہ ان کی گھریلو زندگی پر بھی ہلکے پھلکے انداز میں گفتگو کی ہے۔

مذکورہ کتب کے علاوہ ایک اور کتاب ''برگد کا سایہ'' کے نام سے شائع ہو چکی تھی۔ یہ بھی اردو طبع زاد افسانوں پر مشتمل تھی جو 1998ء میں منظر عام پر آئی تھی مگر ناشر کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہوگئی اور پوری کی پوری کتاب بمعہ مسودے کے غائب ہے۔

افسانوی کتب کے علاوہ بانو دیگر اصناف مثلاً شاعری وغیرہ پر بھی کام کرتی رہی ہیں۔ ان کتب کا ذکر کرنا بھی نامناسب ہوگا۔

زیتون باؔنو نے ڈاکٹر سلمیٰ شاہین کی مدون و مرتب کردہ کتاب ''تورسری'' کا بھی اردو میں ترجمہ کیا ہے جو پشتو اکیڈمی یونیورسٹی آف پشاور نے 2005ء میں شائع کی ہے۔

10۔ منجیلہ (شاعری کا مجموعہ) 2006ء

دوست احباب کے اصرار اور شاید اپنے احساس کی بدولت باؔنو نے فن شاعری پر بھی طبع آزمائی کی اور بالآخر اپنی شاعری کو منظرِ عام پر لانے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ شروع میں باؔنو کا خیال تھا جس کا اظہار وہ بارہا کر بھی چکی ہیں کہ شاعری انسان کی اپنی ذات کے لئے ہوتی ہے کم از کم ان کا اپنی شاعری کے بارے میں تو

خیال تھا۔بہر کیف 2006ء میں بانو کا پہلا شعری مجموعہ پشتو زبان میں "منجیلہ" 6 کے نام سے چھپ چکا ہے۔شائع کرنے والے دانش کتب خانہ پشاور والے ہیں۔

محترمہ بانو کی افسانہ نگاری اور ڈرامہ نویسی کی طرح ان کی یہ شعری کاوش بھی پسند کی گئی ہے امید ہے وہ شعر وشاعری کا یہ سلسلہ جاری رکھیں گی۔افسانے کی طرح شاعری میں بھی بانو نے پشتون معاشرے، بالخصوص پشتون عورت کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

محترمہ زیتون بانو کی کچھ اور کتابیں بھی ہیں جن کے نام یہ ہیں

1۔	زمادائری	(تراجم اور طبع زاد)
2۔	مھتابہ	(ناول)
3۔	سمسور گلونہ	(کھلے پھول) ڈرامہ
4)۔	نیزہ ورے	(افسانوی مجموعہ)

مذکورہ بالا کتب طباعت کے مراحل میں ہیں۔

11۔ نیزہ ورے (سیلابی تنکا)

نیزہ وڑے 7 کا مسودہ پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ بانو کی افسانہ نگاری، فنی پختگی، قادرالکلامی اور موضوع پر مضبوط گرفت کا مثالی معیار بن چکی ہے۔بیشتر کہانیاں ذاتی زندگی کے تجربات، واقعات اور مشاہدات کا نفسیاتی تجزیہ اور بیانیہ انداز لی ہوئی ہیں۔

مثلاً "گونگہ" کہانی میں ایک جگہ ذکر کرتی ہیں۔

ترجمہ:۔

"ایک نہ ایک چچا آواز دیتا" ۔کیا حال ہیں؟ اُپلوں میں رہنے والی مکوڑی!" ۔۔۔"سلامت رہو۔میں صدقے!!" ۔۔۔۔اور میرا دل بے قرار ہو جاتا کہ دوڑ کر جاؤں اور اس کی چھاتی سے چمٹ جاؤں۔اور پھر اس کے ساتھ مل کر اُپلے تھاپوں" ۔۔۔۔مگر چچا جلدی سے آگے دھکیل دیتے۔"آگے چلو!۔۔۔گاؤں پہنچنا ہے۔دیر ہو رہی ہے۔لالہ اور بھابھی پریشان ہو رہے ہونگے!!!۔۔۔کیسے دیدے پھاڑے دیکھ رہی ہو؟" اور میں ٹوٹے دل اور بیزار

جی سے چل پڑتی مگر دھیان اسی کی طرف رہتا۔ جب میں چپکے سے اس کی
طرف دیکھ لیتی۔ وہ بھی مجھی کو دیکھ رہی ہوتی۔۔۔۔۔"

متذکرہ واقعہ ہمیں بانو کی ذاتی زندگی میں بھی نظر آتا ہے یہ وہی باتیں ہیں جوان کی ابتدائی زندگی میں وقوع پذیر ہوتی رہی ہیں۔

ایک سچا اور بڑا فنکار ہوا بند ڈبے میں زندگی نہیں گزارتا بلکہ وہ اپنے سماج اپنے اردگرد اور اپنے عصر میں سانس لیتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ایسے فنکار کی تحریروں میں اس کے اپنے دور کے حالات وواقعات نظر آتے ہیں اور وہ، وہ سب کچھ بعینہٖ پیش کرتا ہے جو اس نے اپنی اس دنیا میں ہوتے دیکھا ہوتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ سارے حالات وواقعات سماج میں موجود لوگوں پر کیسے اثر انداز ہوتے ہیں اور مختلف عمر اور طبقے کے افراد ان سے کیسے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ افسانے "وریتہ" میں دو بچوں کے ذریعے ہمیں بتاتی ہیں کہ آج کی دنیا کے حالات معصوم بچوں کے ذہنوں پر کیا اثرات مرتب کر رہے ہیں۔

بانو کی یہ کتاب پڑھ کر قاری کو ایک بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ پہلی کتاب "هندارہ" سے لے کر اس کتاب "نیزہ وڑے" کے بیچ تقریباً پچاس سالہ اس سفر میں بانو نے افسانہ نگاری کی راہ میں وہ مدارج طے کیے ہیں جن کی بنیاد پر وہ پشتو اور علاقائی ادب کیا بلکہ قومی سطح کے افسانہ نگاروں کی صف میں کھڑی نظر آتی ہیں۔

"نیزہ وڑے" میں اکیس (21) افسانے ہیں۔ اس مجموعے کا ہر افسانہ قاری کو زندگی کے ایک نئے اور انوکھے رُخ کی طرف موڑتا ہے۔

ان افسانوں کے نام ہیں۔

1۔ پیغور (طعنہ)
2۔ ازلی
3۔ کونکتہ (مکوڑے کی مادہ)
4۔ پڑاوونہ (پڑاؤ)
5۔ پت (وفا)
6۔ ڈسٹ بن
7۔ د کیکر ازغے (ببول کا کانٹا)

8۔ جغ (طوق۔ جُوا)

9۔ زوانمردی (جوانمردی)

10۔ دسیندپه مینز کے (بیچ دریا)

11۔ دکوتہي ستنه (کمرے کا ستون۔ اڑواڑ)

12۔ تیغه (کونپل)

13۔ انتقام

14۔ کجاوه

15۔ ډالئی (تحفہ)

16۔ دبخت ستورے (مقدر کا ستارہ)

17۔ کرچے

18۔ یوازې (تنہا)

19۔ وریته (بھنا ہوا)

20۔ سوغات

21۔ درشله (دہلیز)

12۔ زمادائیری 2008ء

یہ کتاب بانو کی دیگر کتابوں سے قدرے مختلف ہے اور وہ ایسے کہ یہ کچھ متفرق اصناف ادب پر مبنی ہے
ں میں چند افسانے، کچھ دیگر افسانہ نگاروں کے افسانوں کے ترجمے، کچھ مضامین، ایک آدھ خاکہ اور
م انشائیہ نما تحریریں اس کتاب کی زینت بنی ہیں۔

یوں لگتا ہے کہ بانو نے اپنی حیات کے بکھرے لمحوں، دنوں، سالوں کے چھوٹے بڑے واقعات اور
ربات کو قلم بند کرنا چاہا ہو۔ یا پھر انہیں تلچھٹ کا نام دیا جا سکتا ہے۔ جو بھی ہو۔ اس مسودے کے تجزیے
ے بعد بانو کی فنی صداقت کا احساس اور بھی بڑھتا ہے۔ یہ بڑھوتی اس یقین کو جنم دیتی ہے کہ بانو کی دیگر
ریروں کی طرح یہ بھی مقبول خاص و عام ٹھہرے گی۔

کتاب میں کل سترہ (17) فن پارے شامل ہیں جو کچھ اس طرح ہیں۔

1۔	چتی (چھٹی)	انشائیہ
2۔	ابراھیم بابا	(خاکہ)
3۔	خیرات	(مضمون)
4۔	تی کس	(ٹکٹ)
5۔	چاچی	(خاکہ)
6۔	چغلی	(انشائیہ)
7۔	ببوجی	(خاکہ)
8۔	نهیی چارشنبه (منگل،بدھ)	(انشائیہ)
9۔	خپله لاسه کله لاسه (آپ کاج،مہا کاج)	(افسانہ)
10۔	دما شو ما نو حق (بچوں کا حق)	(مضمون)
11۔	دنتیجو انتظار (نتائج کا انتظار)	(مضمون)
12۔	هغهء ته (اس (مرد) کے نام)	(افسانہ)
13۔	هغې ته (اس (عورت) کے نام	(افسانہ)
14۔	قامی ورحنې (قومی دن) مضمون	(تاثرات)
15۔	زما کور (میرا گھر) مضمون	(تاثرات)
16۔	فیشن (احمد ندیم قاسمی کے افسانے کا پشتو ترجمہ)	
17۔	تبر (احمد ندیم قاسمی کے افسانے ''تبر'' (کلہاڑی) کا پشتو ترجمہ)	

یہ بات قابل ذکر ہے کہ محترمہ زیتون بانو کی اکثر کتابیں کئی بار شائع ہوئیں۔نصابی کتب میں ان کے افسانوں کو ایک خاص عقیدت کے ساتھ شامل کیا گیا۔کئی یونیورسٹیوں نے ان کے افسانوں کی کتابیں ایم اے،ایم فل اور پی ایچ ڈی لیول کے نصابوں میں ایک عرصے سے شامل کر رکھی ہیں۔نصاب میں شامل کتب بار بار شائع ہونے کی وجہ سے مارکیٹ میں دستیاب ہیں جبکہ باقی کتب اکثر نایاب رہتی ہیں۔کئی ایک تو کتب خانوں سے بھی غائب ہیں۔اور محض تذکرے کی حد تک کچھ کے صرف نام باقی ہیں۔اس کے علاوہ ان کی بے شمار پشتو اور اردو تحریریں گزشتہ پچاس سال سے مختلف جرائید واخبارات میں شائع ہوتی رہیں جن میں سے اکثر تک رسائی ممکن نہیں۔لیکن جو تحریریں دستیاب ہیں انہیں دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ غیر دستیاب تحریریں بھی ایسی ہی معیاری اور موثر ہوں گی۔

بانو کی شاعری:

یسویں صدی نے پشتو ادب کے جو چند ادباء و شعراء پیدا کئے ہیں۔ان میں خواتین لکھنے والیوں میں
مہ س۔ب۔ب اور میرمن زیتون بانو دو اہم نام نظر آرہے ہیں۔محترمہ باتو کا میدان ذرا بڑا اور وسیع
۔معاشرے میں ان کی شخصیت کی حدیں بھی طویل اور فراخ ہیں۔ان کو مردوں کے دوش بدوش کام
نے کے مواقع بھی میسر آئے۔ادبی تقریبات میں بھی مردانہ وار شرکت کرتی رہیں۔جدت
ت،معیار اور مقدار کے لحاظ سے پشتو ادب لکھنے والوں میں باتو نمایاں اور بڑے مقام پر کھڑی نظر
ہیں۔چاہے افسانہ ہو،ڈرامہ ہو،یا شاعری ہو،سب اصناف ادب پر حاوی ہیں۔

محترمہ زیتون باتو پشتو کی سب سے پہلی روشن خیال اور ترقی پسند شاعرہ اور ادیبہ ہیں۔انہوں نے حتی
ورقدامت پسندی سے اپنا دامن بچائے رکھا ہے۔پھر بھی ان کی غزلوں میں کہیں کہیں اس کا تڑکا لگا
ں ہو جاتا ہے۔

میرمن باتو کے بارے میں "زلندہ ستوری" (چمکتے ستارے) کے مؤلف اخونزادہ فرمان مسافر لکھتے ہیں۔

ترجمہ:۔

"میرمن زیتون باتو شاعری کے میدان میں بھی پشتو ادب کے فروغ کے لئے
اپنے قلم سے کام لے رہی ہیں۔اپنی غزل کا معیار بلندی تک پہنچا چکی ہیں اور
جدت کا جھنڈا ہاتھ میں لئے آج کے ادبی اور فکری تقاضوں کے مقصد اور منزل
کی طرف آگے ہی آگے بڑھتی چلی جارہی ہیں۔ان کے اشعار ان کے داخلی
جذبات کی عکاسی کرتے ہیں اور ہر شعر میں الفاظ کے رنگین موتی اس ہنر سے
پرو دیئے ہیں کہ پڑھنے والے کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔"

په نامه مې کربنی مه را بنکه نقاده!!

زهٔ هغه نيمه چې ليکمه غزلې

ترجمہ:۔

نقاد!! میرے نام پر لکیریں مت پھیرو۔میں وہ ہوں جو غزلیں لکھتی ہے!!۔
ور پروفیسر شاہجہان رقمطراز ہیں:۔

ترجمہ:۔

''شاعری میں زیتون بانو کا جھکاؤ زیادہ تر غزل کی طرف ہے حسن و عشق کی کیفیات بیان کرنا ان کی غزل کا خاص موضوع ہے۔لیکن غزل میں زندگی کے دیگر مسائل بھی چھیڑتی ہیں۔اس کے علاوہ زیتون بانو کی شہرت،ان کے خیالات وافکار کے حوالے سے ایک صحت مند تغیر کی بدولت ہے۔''

(پختو ادب کنبی دمیرمنو برخہ ص245)

زیتون بانو کے تخلیق کردہ پشتو ادب کی مثال اس سے قبل ہمیں کم از کم پشتو میں نہیں ملتی۔ایک پشتون عورت کے جذبات،احساسات،قلبی واردات،زندگی کا ڈھنگ،زیست روزگار اور اس کا مقام و کردار اور منظر کشی کا اتنے منطقی اور مدلل انداز میں اظہار اس سے پہلے کسی نے کیا اور نہ ہی کسی کو حوصلہ ہو سکتا تھا۔ایسے لوگ Trend Setters ہوتے ہیں جو نئی راہیں تراشتے ہیں اور دوسروں کو ان پر گامزن ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔

محترمہ بانو نے اپنی تحریروں میں ہمارے معاشرے کے بعض گلے سڑے بدبودار کرداروں پر سے پلو سرکایا ہے۔ایسی جرأت پر کچھ لوگوں کی پیشانیوں پر پسینہ پھوٹا۔کچھ کے ماتھے پر بل بھی پڑے۔الزام لگے۔تہمتیں باندھی گئیں مگر بانو نے ہر جائز ناجائز رویہ سہہ لیا۔سب ملامتیں برداشت کیں کہ ہر عظیم لیکھک کے ساتھ یہ سلوک ہوتا آیا ہے۔

ایک انٹرویو کے دوران ڈاکٹر سلمٰی شاھین سے جب سوال ہوا کہ اتنے بولڈ موضوعات پر اتنی جرأت اور بے خوفی سے قلم چلاتے ہوئے آپ کو مشکلات اور رکاوٹوں کا سامنا تو ہوتا ہوگا؟

سلمٰی شاہین صاحبہ کا جواب نفی میں تھا کہ''ان راہوں میں جو رکاوٹیں کھڑی تھیں اور جو مشکلات درپیش تھیں وہ سب بانو ہٹا چکی ہیں۔مخالفت کے سارے ہی پتھر خود کھا کر راستے کے کانٹے چن چکی ہیں اور اب خطرات ٹل چکے ہیں اور راستے صاف ہیں۔''

11 اپریل 1951ء کے روزنامہ''انجام''میں پشتو کے ادبی صفحے پر زیتون بانو کی ایک غزل ان کے اپنے اصلی نام کے ساتھ پہلی بار چھپی کہ اب تک وہ اپنی تحریریں فرضی ناموں سے چھپوایا کرتی تھیں۔جناب اجمل خٹک اس پشتو صفحے کو ایڈٹ کیا کرتے تھے۔فٹ نوٹ میں انہوں نے لکھا تھا کہ ''زیتون بانو واقعی اگر کوئی پشتون دوشیزہ ہے تو پشتو ادب کا مستقبل روشن اور تابناک ہے۔''بانو اپنی اس

ت پر بہت خوش تھیں کہ انہوں نے پہلی بار اپنے نام کے ساتھ اپنی کوئی تحریر چھپی ہوئی دیکھی۔ اخبار
، کو دکھایا۔ ماں نے خوش دلی سے کہا۔ "پگلی!! تمہیں نہیں معلوم اری! تم تو پیدائشی شاعرہ ہو۔" اس
۔ ت باتو چھٹی جماعت میں تھیں جب "انجام" اخبار میں وہ غزل چھپی تھی۔
محترمہ باتو کی بے چین روح اور تخلیقی مزاج اپنا رنگ دکھلاتا رہا۔ اشعار کہتی رہیں۔ اب وہ اپنے اصلی
، سے چیزیں چھپوانے کی ہمت خود میں پا رہی تھیں لیکن ساتھ والد صاحب کا خوف بھی دامن گیر رہا۔
شاعرانہ مزاج کے حوالے سے باتو صاحبہ خود ایک جگہ کہتی ہیں۔
"میں بہت چھوٹی سی تھی اتنی چھوٹی کہ اس وقت مجھے صحیح بولنا بھی نہیں آتا تھا۔ اس زمانے میں خاندانی
ات کچھ ایسے تھے کہ ہم آبائی گاؤں، پیسنہ وڑی ء سے کافی فاصلے پر "اچینی بالا" نامی گاؤں منتقل
ئے۔ جہاں میری ننھیال تھی نانا کے ایک چھوٹے سے مکان میں اٹھ آئے تھے۔ یہ ماحول میرے لئے
ں اجنبی تھا۔ اپنے گھر کی یاد ستاتی۔۔۔۔ خوب روتی۔۔۔۔ رونے کا انداز یہ ہوتا۔۔۔۔ کہ چھوٹا
ٹین کا ایک ڈبہ میرے پاس ہوتا۔ اس کو لکڑی سے بجاتی جاتی۔ کچھ بے معنی کچھ بامعنی الفاظ 'لے' اور
ِسے گاتی جاتی۔۔۔ ٹیپ کے مصرعے کے طور پر شادو۔ شادو۔ شادو آخر میں دہراتی رہتی اور آنسو
نِ جاتی۔ اسے آپ میری شعر و شاعری کا آغاز سمجھیں۔
شادو میرے آبائی گاؤں میں ہماری "مور جان" کی شاگرد تھی جو قرآن مجید کا سبق پڑھنے کے بعد
ہمہ پیار سے کھلاتی رہتی تھی۔
میر من باتو کے شعر کہنے پر والد صاحب نے بارہا سمجھانا چاہا کہ غزلوں، افسانوں اور لکھنے لکھانے سے
۔ ان کا پیٹ نہیں بھرتا یہ غیر مفید مشاغل ہیں لیکن باتو مفید اور غیر مفید کے چکر میں پڑے بغیر تخلیق کرتی
ں۔ وقتاً فوقتاً ان کی منظومات شائع ہوتی رہیں۔ مگر شاعری کی نسبت انہوں نے نثر پر زیادہ توجہ دی اور
وعات میں زیادہ تر رجحان اسی طرف رہا۔ اپنی شاعری کو منظر عام پر زیادہ نہ لانے کے سوال پر ان کا
ب تھا۔ "شاعری میں ایک چیز ہے اور وہ یہ کہ میرے خیال میں شاعری اپنے لئے ہوتی ہے"۔ 8
ور آخر کار مارچ 2006ء میں ان کی شاعری کی پہلی کتاب "منجیلہ" شائع ہوئی جس میں اعلیٰ معیار
، شاعری ملتی ہے۔ ان کی شاعری کے بارے میں "منجیلہ" کے پیش لفظ میں پشتو کی ممتاز شاعرہ
یا شاہین یوں لکھتی ہیں۔

ترجمہ:

"باتو کے افسانوں کی طرح ان کی شاعری بھی لطیف موضوعات اور زندہ افکار و

خیالات سے معمور ہے۔ باتو شاعری میں بھی زندگی کے حقائق بیان کرتی ہیں۔ شعر برائے شعر نہیں کہتیں بلکہ وہ شاعری میں معاشرتی اور سماجی رویوں پر تنقید اور زندگی کے حقائق کا اظہار کرتی ہیں۔ ان کے اشعار میں جا بجا عورت کی عظمت اور بڑائی کا اعتراف، معاشرے میں عورت کے ساتھ روا رکھا گیا تضحیک آمیز رویہ اور عورت کی مجبوری اور بے بسی کا احساس انگڑائیاں لیتا نظر آجاتا ہے"۔ 9

دتخلیق په کارکنبی رب کړمه همسیاله
په نصیب کنبی دسور بټ وریته پولئی یم
چرې تود بادبه مې هم پرې پیروزونه وو
دهغو نظر کنبی اوس توده سلیئی یم

ترجمه:

''تخلیق کے وصف سے رب نے اپنا ہم پلہ بنا تو دیا مگر نصیب دیکھو!! دھکتی بھٹی کا جلا بھنا دانہ ہوکر رہ گئی ہوں۔ وہ جن کو گرم ہوا کے تھپیڑے بھی لگنے نہ دیئے ،انہی کی نظر میں آج آگ اگلتی آندھی ہوں۔''

اس سلسلے میں سلمٰی شاہین اپنی رائے دیتے ہوئے کہتی ہیں:۔

''اور اسی عورت ذات کی مظلومیت اور اس کے بارے میں معاشرے اور سماج کا قابلِ افسوس بے رحم رویہ اور عورت کی بے بسی اور کمزوری کا وہ احساس ہے جو باتو کی نثر میں جگہ جگہ بکھرا پڑا نظر آتا ہے۔ اس کے اشعار میں بھی اسے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ 10

دلورخور دپیغلتوب پیتے به دومره درونډوی
چې دتول کلي دمور پلاء اوږې یئې اوړلے نه شي!!

ترجمه:۔

''جواں بیٹی ، بہن کی دوشیزگی کا بوجھ اتنا بھاری ہوتا ہوگا جو سماج اور ماں باپ کے کندھے اسے اٹھانے سے قاصر ہو جاتے ہیں''۔

اگر زیتون باتو کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی پہلی شعری کوشش پر نظر ڈالی جائے جوانہوں نے

گیارہ برس کی عمر میں کی تھی تو ان کی والدہ کی کہی ہوئی بات درست ثابت ہوتی ہے کہ بانو واقعی پیدائشی
رہ ہے اس بارے میں میر من بانو بتاتی ہیں:۔
''میں اس وقت چوتھی کلاس میں تھی جب میں نے باقاعدہ نظم کہی تھی۔ نظم لکھنے کا محرک بھی بتاتی
ں۔
ہوا یہ کہ اسلامیہ کالج پشاور کے اولڈ بوائیز ایسوسیشن کا خیبر یونین ہال میں فنکشن تھا۔ جہانزیب نیاز
حب بھی مدعو تھے۔ ان کو سٹیج پر آنے کو کہا گیا تا کہ اپنا کوئی کلام ترنم سے سنائیں۔ جہانزیب نیاز
حب بڑے خوش گلو، سریلے اور وجیہہ پشتون ہیں۔ انہوں نے اپنی ایک نظم خوش الحانی سے سنائی جس کا
ہوم کچھ یوں تھا کہ۔۔۔۔' میں ایک سادہ سا بہادر پشتون ہوں۔ اپنی روایات کو نہیں بھولا ہوں اور
پنے لباس اور پگڑی کا بڑا خیال رکھتا ہوں۔ مجھے اپنے شملے پر ناز ہے'۔۔۔۔۔ اس وقت نیاز صاحب
کالی پتلون اور سبز کوٹ میں ملبوس، کلین شیوڈ تھے۔ ہاتھ میں فیشنی چھڑی لہرا رہے تھے۔ ظاہر ہے ان
سر پر پگڑی بھی نہیں تھی۔ ان کو اس حلیے میں دیکھ کر میں نے یہ نظم لکھی:

پاس په ستیج باندې ولاړ دے
وهی چغې چې پښتون دے
نه یئے ګیره نه یئے بریت شته
اغوستی یئے کوټ پتلون دے
په کړه وړه اوهم لباس کښې
دانګریز سره سمون دے

ترجمہ:۔

''سٹیج پر کھڑے ہو کر چیخ رہے ہیں کہ پشتون ہوں۔ نہ داڑھی ہے نہ مونچھ ہے
کوٹ پتلون پہن کر انگریز بننے کی کوشش کر رہے ہیں'' اور یوں چوتھی جماعت
سے شروع ہونے والا بانو کا لکھنے لکھانے کا یہ سلسلہ آج تک جاری ہے''۔

محترمہ زیتون بانو نے اپنے ادبی سفر کی شروعات شاعری سے کی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں
ں نے نثر کی طرف اپنی توجہ مبذول کرائی اور پشتو افسانے کو بام عروج تک پہنچانے کے لئے جت
یں۔ ڈرامے بھی لکھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاعرہ بانو، افسانہ نگاری اور ڈرامہ نگاری سے پیچھے رہ گئیں۔ ورنہ

قرائین بتاتے ہیں کہ ان کی شاعری بھی ان کی شہرت کا سبب بن سکتی تھی۔اس کا قطعی یہ مطلب نہ لیا جائے کہ زیتون بانو نے شاعری میں پشتو ادب کو کچھ دیا ہی نہیں ہے۔پشتو کے اخبار ورسائل میں انکی چھپی شاعری اس حقیقت کا بیّن ثبوت ہے۔

میرمن بانو شاعری کو اپنی زندگی کا ایک حادثہ سمجھتی ہیں۔خود ہی کہتی ہیں۔

چې مې پل د شاعرۍ په زمکه کېښود
دا زما دژوندینو لویه حادثه وه

ترجمہ:۔

''شاعری کے میدان میں قدم رکھنا میری زندگی کا ایک بڑا حادثہ تھا۔''

محترمہ زیتون بانو نے بڑی معیاری غزلیں کہی ہیں لیکن داخلی کیفیات کے اظہار کی رو سے ان کی نظمیں اور خاص طور سے پھر آزاد نظمیں سراہنے کی قابل ہیں۔غالباً انہوں نے اپنے ارفع خیالات اور قلبی واردات کے لئے آزاد نظم کو ترجیح دی ہے۔

لگتا ہے بانو کی طبع رسمی پابندیوں کی زیادہ متحمل نہیں ہوسکتی۔ردیف، قافیہ کی پابندی بھی ایسی ہی پابندیوں کے زمرے میں آتی ہے۔

وقت کے تقاضوں کے لحاظ سے پشتو کی جدید شاعری میں کامیاب تجربے بھی ہونے ضروری ہیں۔نئے دور کے ادبی رجحانات بھی بانو صاحبہ کی نظر میں ہیں۔وہ جانتی ہیں کہ بعض افکار وخیالات قافیہ ردیف کی چھری تلے آجاتے ہیں اور ان کا پورا اظہار ممکن نہیں رہتا۔اس لئے آزاد نظم میں طبع آزمائی کرنا زیادہ سہل رہتا ہے۔

میرمن زیتون بانو کی شاہکار نظم ''میراث''(ورثہ) اپنی مٹی سے بے انتہا پیار اور والہانہ محبت وعقیدت کی عکاسی کرتی ہے۔آنے والی نسل کو اس مٹی کی عظمت دکھاتی ہیں۔ساتھ ہی ایک حساس بزرگ اور غیرت مند خاتون کی حیثیت سے اقرار بھی کرتی ہیں کہ ہم اپنی نئی پود کے لئے ورثے میں کیا چھوڑے جا رہے ہیں ہم تو اس مٹی کی ساری خوشبوئیں لوٹ چکے ہیں۔پیارے پیارے کول پھولوں کو مسل چکے ہیں۔نئی نسل کو وراثت میں صرف کانٹے ہی ملیں گے!جو وہ بوئیں گے جو وہ کاٹیں گے!!!

بانو صاحبہ اپنی اس نظم ''میراث'' میں اپنے جذبات، اپنے احساسات اپنے ملک وقوم کے لئے پیار بھرے مگر دکھی دل کی پکار کا اظہار بڑی جرأت سے اپنے فطری سچ کی جلو میں کررہی ہیں۔دراصل وہ اپنی

نسل کی نمائندہ بن کر بات کرتی ہیں۔

اس وقت زیتون بانو خود بھی بزرگوں کی صف میں کھڑی ہیں مگر وہ سچ اور حقیقت کی وہی مشعل ہاتھ میں لئے کھڑی ہیں جو اپنی پہلی تحریر میں روشن کر چکی تھیں۔ وہ بزرگوں کی صرف بزرگی کا احترام نہیں کرتیں وہ ان کو یاد دلاتی ہیں کہ انہوں نے اپنے وطن اور نئی نسل کے ساتھ جو کیا اچھا نہیں کیا۔ بانو خود نئی پود کے سچے رویے کی طرف بھی ہیں، ان کی ذہانت کی گواہی بھی دیتی ہیں اور نئی نسل کے تابناک مستقبل کی متمنی بھی ہیں۔

''میراثہ'' نظم میں بانو کا لہجہ بڑا شدید ہے، ماتمی ہے اور ملامت بھرا بھی۔ وہ اپنی مٹی سے روا رکھے گئے رویے پر شرمندہ ہیں۔ اپنے ملک سے بہیمانہ سلوک پر پشیمان ہیں۔ اپنے کئے پر پچھتاتی ہیں۔ مگر وقت اب گزر چکا ہے۔

''میراثہ'' نظم کی کاٹ کو خود ہی محسوس کیجیے۔

نظم ''میراثہ'' (اردو ترجمہ) زیتون بانو

''ورثہ ''(میراثہ)

بیٹے!! میرا یہ سر تیرے آگے جھکا ہوا ہے۔
میں شرمندہ ہوں!!
تیرے ساتھ اور وعدے نہیں کر سکتی
اپنی زبان، اپنے عہد پر بے اعتبار ہو گئی ہوں
میں خود ملامت ہوں۔۔۔ تجھے کیسے دوش دوں؟
کیسے تجھ پر نئی پود کا بوجھ لاد سکتی ہوں؟؟
تو اپنے کندھوں پر یہ بوجھ کیسے اٹھا سکے گا؟
میں نے تجھے کس لائق چھوڑا ہے جو۔۔۔
اب میں یہ طمع رکھوں کہ۔۔۔۔۔۔۔
جب تو بڑا ہوگا
جوان ہوگا تو پھر
اس وطن کی مٹی پر اپنا سر نثار کرے گا۔

اس پر اپنی جان نچھاور کرے گا۔

تو اس کے ناموس کا محافظ ہوگا

تو اس وطن سے پیار کرے گا

تو اس کی مٹی کا امین ہوگا

تو اس وطن کا رکھوالا ہوگا

میں خود جو اس مٹی پر پلی بڑھی ہوں

اس کی مٹی پر کھیلی کودی ہوں

اس سے مجھے پیار تھا۔

میں اس کی مٹی کی امین تھی

میں اس سے محبت کرتی تھی

مگر ۔۔۔۔

اس مٹی کی ساری خوشبوئیں لوٹ چکی ہوں

حسین پھول اور کومل کلیاں نوچ چکی ہوں

اپنے بالوں میں سجا چکی ہوں۔

تیرے واسطے چھوڑا گیا ہے؟

تیرے لئے رہا گیا ہے؟

چند کانٹے رہ گئے ہیں!! یہ کانٹے!! ۔۔۔۔۔۔۔

جو زہر بھرے ہیں

جو زہر یلے ہیں!!

جو نوکیلے ہیں!!

جب تو بڑا ہوگا۔

جوان ہوگا

تو ان ہی زہر بھرے کانٹوں کی

رکھوالی کرے گا۔

یہی کانٹے بوئے گا۔ یہی کانٹے کاٹے گا۔

میں ایسی کانٹوں بھری زمین وراثت میں چھوڑے جارہی ہوں۔

(نظم میراثہ۔ ''منجیلہ'' ص26)

پشتو نظم

''میراثه''

بچیه سر مې درته بنکته دے تیټ سترګې یمه
خکه زۀ اوس نورې وعدې درسره نه کومه
په خپله ژبه په خپل لوظ مې باور پاتې نه شو
زۀ ملامته یم نوتا به ګله څهٔ کرمومه
خکه وعدې زۀ نورې نه کومه
څنګه دا ووایم چې ته مې مستقبل ئې ګله
څنګه په تا د نوې کهول پیتې در واچوومه
ته به دا بار په اوږو څنګه وړې ؟
ته مې د څهٔ جوګه پریښودے ئې چې
زۀ دې د تا نه اوس دا طمع وکړم
چې ته رالوئے شے اوځلمے شے نو بیا
د دې وطن په خاوره سر به ایږدې
د دې ناموس به ساتې
ته دې وطن سره به مینه کوې
ته به امین ئې د دې
ته دا وطن به ساتې
زۀ چې پخپله په دې خاوره لویه شوې ورمه

زۀ په دې خاوره لوبېدلې ورمه

په دې مئينه ورمه

زۀ د دې خاورې هم امينه ورمه

زۀ پرې مئينه ورمه

خو ....

د دې خاورې خوشبويي مې ټولې ولوټلې

ښکلې ګلان ښکلې کلي مې ټولې وترورلې

په سر مې چتر کړلې

تا ته مې څه پرېښوده!

اوس تا ته څه پاتې شو؟

يو څو ازغي پاتې شو!!

دغه ازغي چه ټول د زهرو ډک دي

تېرۀ سرونه لري

ته چې رالوڼې شې ګله

دغه ازغي به ساتې

دغه ازغي به کرې

دغه ازغي به رېبې

داسې ازغنه زمکه تا ته په ميراث کښې پرېږدم

(نظم میراث: مجلہ ص26)

بانو تنہائی کے سلگتے دھواں دیتے ہوئے احساس کو ازل سے ساتھ لائی ہیں۔ ''دازل لیک'' (ازل کی تحریر) نظم میں اپنی ''ازلی تنہائی'' کے بارے میں بڑے دلکش اور رومانوی انداز میں بات کرتی ہیں مگر ایک ماں کی ''ازلی تنہائی'' کا احساس بانو نے جس فنکاری اور ہنرمندی سے ''تنہائی'' نظم میں باندھا ہے۔ وہ لاثانی ہے۔

یہ نظم اکیلے پن کے اندھیاروں میں ایک ماں کی تنہائی کی دلخراش چیخیں ہیں جو کہ ایک نارمل ذہن کو بھی ہلا دیتی ہیں۔وہ ماں۔۔۔۔جو اپنی جوانی کی کتنی گرم سرد راتیں اولاد پر نچھاور کر چکی ہے۔اپنی زندگی کی توانائی کا ہر قطرہ اولاد کو دیتی رہی ہے۔ان کے بہتر مستقبل کے کتنے ہی حسین خواب بُن چکی ہے۔مگر اب ۔۔۔اس ماں کا اپنا مستقبل کیا ہے؟ تنہائی!۔۔۔اور صرف تنہائی!!وہ تنہائی جو اس کا مقدر بن چکی ہے۔ آیئے ہم بھی تھوڑی دیر کے لئے ماں کی اس تنہائی کا حصہ بن جائیں۔

زیتون بانو (اردو ترجمہ)

تنہائی

بچپن کا وہ بے رنگ کھیل، وہ بے کیف کھیل
کچی مٹی کے بنے پانی کے بھرے مٹکے کے پاس کھڑی رہتی
کٹوریاں بھر بھر پانی زمین پر انڈیلتی جاتی
زمین گیلی ہو جاتی، کیچڑ بنتا
کچی مٹی کے کچے کیچڑ سے اپنے ننھے ننھے بے ہنر ہاتھوں سے
کچھ ٹیڑھے میڑھے بت بناتی، سورج کی تپتی دھوپ میں سکھانے رکھتی
میں کتنی خوش ہوتی۔میں اپنے اس فن پر کتنی نازاں ہوتی!
کتنی مغرور ہوتی!! ہمجولیوں کو بار بار دکھاتی۔
کوئی سکھی سہیلی اگر کہتی۔
''ایک تو مجھے دو!'' تو میں دکھی ہو جاتی
بڑی دلگیر رہتی
سوچوں میں پڑ جاتی۔
''دوں کہ نہ دوں!!''
زندگی کی دھوپ میں
وقت کی بھٹی میں پکی ہوئی وہ مورتیاں کیا ہوئیں؟
کدھر گئیں؟؟ میں بے خبر ہی رہی!!

مجھے پتہ ہی نہ چلا، وقت ہاتھ سے نکل چکا

بچپن کا زمانہ بیت چکا

کب جوانی آئی، کب گئی۔ وہ سارے زمانے کیا ہوئے؟

زندگی کے دن کیسے بیتے؟

مجھے پتہ ہی نہ چلا۔

میں کیسی انجان ہوں!

میں کتنی نادان ہوں!

میں کتنی بے ہنر ہوں!!

ہاں!! صرف یہ یاد رہا کہ

اپنے گوشت پوست سے، اپنے خون سے سینک سینک کر

میں نے چند بت گھڑے تھے، چند مورتیاں بنائی تھیں

کچھ تصویروں میں نقش بھرے تھے

وہ کدھر گئیں؟ کیسے گئیں؟ کیا ہوئیں؟؟

کون لے گیا؟

کس نے چھینی میری بنائی ہوئیں وہ تصویریں!

وہ مورتیاں!!

وہ بت!!

پتہ ہی نہ چلا۔

میں کتنی نادان "ماں" ہوں۔ صرف نام کی ماں

جواب---------

خالی ہاتھ،

اپنے نام کے ساتھ

تنہا کھڑی ہوں

("منجیلہ" صفحہ 128,129)

"تنهائي"

د ماشوم توب هغه بې رنګه لوبه
هغه بې خونده لوبه
ډکې چاتې ته به ولاړه وومه
ډک کټورې به مې په زمکه توئے کړل
زمکه لونده به شوه، خړوبه به شوه، ختې به شوه
د کجه ختې نه به خپلو بې هنرو ګوتو
ما به کاږهٔ واږهٔ بوتان جوړول
په سرو غرمو کښې به په نمر مې ايښول
څومره خوشحاله به ووم
څومره مغروره به ووم
خپلو ملګرو سهيليو ته به مې بيا بيا ښودل
که چا ملګرى به مې ووې
بوټې ما له راکړه
څومره خفه به شوم دلګيره به ووم
سوچ کښې به پرېوتم چې ور کړم که نه؟
دژوند په نمر وُچ شوي
د وخت بتې، کښې سوخته
هغه بوټکي به کومو لارو کښې مات ګډ پراته وي
زهٔ لرې خبر نه يمه
زهٔ لرې خبر نه شومه

هغه وختونه لاړل

د وړوکوالي زمانه تېره شوه

د پهغلتوب په ښکالو پوه نه شومه

خواني مې چا سره ملګرې شوه او چرته لاړه

ژوندون مې کله تېر شو

څهٔ بې هنره تېر شو

دومره مې ياد دي چې د تن په وينو

څو ښکلې ښکلې تصويرونه مې جوړ کړي څو وو

چې هغه چرته لاړل؟

څنګه لاړل؟

چا يوړل ؟

او چا وتښتول؟

زهٔ هيڅ خبر نه يمه

زهٔ هيڅ خبر نه شومه

څهٔ بې هنره مور يم

تش لاس ولاړه يمه

زهٔ د خپل نوم سره تنها پاتې شومه

("منجيله" ص ۱۲۸. ۱۲۹)

راقم نے میر من زیتون بانو کے چند پشتو اشعار اور نظموں کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ان میں سے دو نظمیں حاضر ہیں۔۔۔۔ظاہر ہے کہ کسی ایک زبان کا ترجمہ دوسری زبان میں ایسا ہے جیسے پرعنڈ کپڑے کی الٹی طرف۔مگر کوشش کے بعد کی یہ کاوش اس قابل ضرور ہے کہ بانو کے احساسات، جذبات، خیالات اور قلبی واردات اور افکار آپ تک پہنچائی جائیں اور ان سے کسی حد تک آگاہی ہو سکے کہ بانو کیا؟ اور کیوں کہنا چاہتی ہیں۔بانو تخیلاتی دنیا میں خود گئی ہیں اور نہ ہی اپنے قاری کو گم ہونے دے رہی ہیں ۔جو سچ ہے، جو حقیقت

،،جوموجود ہے وہی جذب کر کے معاشرے کو واپس دے دیتی ہیں۔ بقول ساحر لودھیانوی

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

میرمن زیتون بانو کی دو نظموں ''لٹون'' اور ''پیتے'' کا منظوم ترجمہ ملاحظہ کیجیے:۔

پشتو سے ترجمہ

مترجم:۔ اباسین یوسفزئی

تلاش

یہ حقیقت ہے کہ سچی ہے محبت میری
معترف ہوں کہ تجھے پیار کیا ہے میں نے
مانتی ہوں کہ خیالوں میں میرے تو ہی ہے
ذکر ہو فکر ہو تیرا ہے۔یہی میری حیات
چار سو تو ہے ہر اک سمت ہے ڈیرا تیرا
زندگی کا میری مختار ہے مالک تو ہے
اور مری سوچ کی بنیاد ترے ہاتھ میں ہے
مرے افکار کے سینے میں دھڑکتا تو ہے
تری مسکان کا ہالہ ہے مری ذات کے گرد
سب مناظر کا ہے آغاز ترے چہرے سے
میرے احساس کا سرچشمہ تیری ذات ہی ہے
ہے منور مرا کل،آج،مرا آئندہ
یہ حقیقت ہے مری ذات کا محور تو ہے
مانتی ہوں کہ تری ذات سے ہے رنگِ حیات
حسن وزیبائی جو ہے،جتنی ہے دم سے ہے ترے

یہ جو سب کچھ ہے ترے واسطے تیری خاطر
زیست کے رنگ جو ایجاد ہوئے تیرے لئے
میں تو کچھ بھی نہیں اے جانِ جہاں تیرے بغیر
میں اگر تیری جگہ ہوتی تو کیا ہوتا تو
مان لے اب یہ حقیقت کہ نہیں تھا جب تو
زندگی کا میری مرہون ہوا تیرا وجود
میں نے تیرے لئے اور تیری بقا کی خاطر
خون اپنی ہی جوانی کا کیا ہے میں نے
اور بدلے میں نہیں مانگا ہے کچھ بھی تجھ سے
ہاں ! مگر پوچھ رہی ہوں میں فقط ایک سوال
کتنی پریوں کو تو نے دل میں بسا رکھا ہے؟؟

(پشتو نظم "لتون" کا ترجمہ۔
("منجیلہ" ص124,125)

پشتو نظم

لتون

دا هم رشتیا دي چې مې تا سره سوچه مینه ده
دا هم دروغ نه دي چې تا باندې مئینه یمه
دا هم منمه چې هم ته مې په خیالونو کښې ئې
هم ستا په فکر، ستا په ذکر باندې پایمه زهٔ
هر خوا ته تهٔ ئې بس هم تهٔ ئې تش هم تا وینمه
زما د وینې او د خوب دنیا کښې ته وسېږې
زما د ژوند زما د مرګ قبضه ده ستا په لاس کښې
زما د سوچ هره رده پخپله تا اېښې ده
تا مې د فکر هرې کړ بنې ته دے ژوند بخښلے

دې ګهر چاپېره تول ماحول کښې راتــه تهٔ مو سېږې
هــره لـمحــه، هــره لحظه کښې راتــه تهٔ ښکارېږې
دا هــم رشتيا دي چې زهٔ ستــا د لاســه 'زهٔ' يــمــه نن
زمــا پــرون، سبــا او نن رڼا دي ستــا پــه وجــه
دا هــم دروغ نــه دي چې تــهٔ د کــائينات مــحور ئې
دا هــم منــمــه چې هــم تــا دے ژوند تــه رنګ ور کړے
دا ګهر چـــاپېره تول رنګونـــــه رنګينی چې وينې
دا هر څهٔ ستا دي، هر څهٔ تهٔ ئې، هر څهٔ تاله دي جوړ
د ژونـــدون ټولې ښکلاګانې واړه تـــــا د پـــاره
دا هــر څه تــهٔ ئې هــر څهٔ ستــا دي هــر څهٔ تــا د پاره
دا هــم منــمــه چې کــه تــهٔ نــه وے نــو زهٔ بــه څهٔ وے
خــو زهٔ کــه تــهٔ وے نــو تــهٔ روايه چې تــه بــه څه وې
چې تــه لا تــهٔ نهٔ وې اوس تــهٔ شو ې نــو تــهٔ دا ومــنــه
چې ستــا د تـــهٔ او شتــه وجــود تــخليق زمــا ذمــه ده
ستـــا د بــقــا د پــاره مــا څومــره کړون کړے دے
د خپلو ښکلو خوانو شپو مې دومره خون کړے دے
زهٔ پــه بــدل کښې تــا نــه هيڅ نــه غوا ړمــه ويرېږه
بــس يو پو ښتنه درنــه کړمــه چې خفــه پر ې نــه شې
چې ستــا د زړهٔ حــرم کښې څومــره ښاپېرۍ وسېږې

("منجيله" ص ۱۲۵.۱۲۶)

پشتو سے ترجمہ
مترجم :اباسین یوسفزئی

بوجھ

گھر کی کھڑکی سے جو دیکھا تو میں بدنام ہوئی
میری نیت میرے کردار میں کچھ کھوٹ نہ تھی
کیوں مگر کوچہ و بازار میں چرچا ہے میرا
میں سراسر اسی ماحول کی پروردہ ہوں
میں نے ہجولیوں، سکھیوں میں یہ بچپن دیکھا
رات دن آنکھ مچولی کا بھی رہتا تھا سماں
چور بن جاتا تھا کوئی تو کوئی شاہِ زماں
میں جو پیش پیش ہی رہتی تھی اپنی ٹولی میں
نہ میں نے کھیل میں کھائی شکستِ فاش کبھی
پسند آتی تھی ہر اک کو میری ہی سرداری
سب اپنے شوق سے کرتے تھے میری دلداری
اب میں حیران ہوں کیا ایسا ہوا مجھ سے قصور
بات کوئی بھی ہو چرچا میرا کرتے ہیں ضرور
میرے کردار کو مشکوک بنا رکھا ہے
آنکھ میں بھائی کے کیوں خون اتر آیا ہے
کس لئے باپ کے تیور بھی بدل جاتے ہیں
ماں کی نظروں میں دیئے غیض کے جل جاتے ہیں
بس اگر ان کا چلے یہ میرے ٹکڑے کر دیں
زندگی کو میری وابستہ الم سے کر دیں
ایک دو راہے پہ حیران کھڑی سوچتی ہوں
سارے رشتے بھی ہیں ناطے بھی ہیں ان لوگوں سے
پوری بستی پہ میری ذات گراں ہے کتنی؟؟

(پشتو نظم ''پیٹے'' سے ترجمہ)

پشتو نظم

پیٹے

د کور باری نه مې لش وکتل بدنامه شومه

زما پـه نيت کښې خو څهٔ نـه وو خو دا و لې داسې
کـلي کښې کـور پـه کـور زما بـده نامه خوره شوه
زهٔ خـو هـغـه يم، چې بـه دلتـه کښې مې لو بې کو لې
دلتـه پـه لارو پـه کو څو کښې بـه مې منډې تر نلې
د هـلـکـانـو جـيـنـکـو سـره يـو ځـائـے وهلې
کـه پټ پټـونـي، کـه ا ډې گوډې بـاچـا بـاچـا بـه وو
زهٔ بـه د هـرچـا نـه ورومبی پکښې شـريـکـه وومـه
مـا بـه پـه لوبـه کښې هـم ماتې چرې نـه خو ړلـه
ځکـه بـه هر چا زهٔ د خپل ټولګي سرداره کړمـه
مـابـه د هر چا زړهٔ سـاتلو، ټول خـوشـحال وو له ما
اوس را نـه څهٔ داسې گناه، داسې خـطـا شـو ې ده
چې د کـور کـلـی خـلق مـا پسې خبـر ې کـوي
د قهـر وينې مې د ورور ستـر گو کښې اوړي راوړي
د پـلار د بريتو سپين ويښتهٔ مې نن هم نيغ ولاړ دي
مور مې پـه برندو برندو گورې خـو پـه چل نـه رسي
چې چمغړق راله راتاؤ کړي کـه مې دوه تـوتې کړي
زهٔ هـم حيـرانـه يم دوجـالـه کښې انښتې يمـه
د لُور او خور د پـهغلتوب پـهتيے بـه دومره دروند وي
چې دټول کـلـي، د مـور پـلار اوږې ئې ورلـے نشي
(''منجيله'' ص ۲۳)

غزل، پشتو زبان وادب کے لئے کوئی نئی یا انجانی صنف سخن نہیں ہے بلکہ دیکھا جائے تو پشتو شعرا نے
بانسبت غزل پر زیادہ توجہ دی ہے وہ الگ معاملہ ہے کہ

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

م یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ہر شاعر شاہکار غزلیں نہیں کہتا مگر یہ دم غنیمت ہے کہ شعراء وادباء پشتو کے

تحریری ادب میں اپنے اپنے حصے کا کردار بڑے جذبے سے ادا کر رہے ہیں اور تعریف و تحسین کے مستحق ہیں۔
پروفیسر افضل رضا مرحوم کہتے ہیں:۔

ترجمه:۔

''محترمہ زیتون بانو کی غزل ایک منفرد رنگ کی حامل غزل ہے۔ یہ رنگ ان کے تغزل کا رنگ ہے جو بعض اوقات انہیں اپنی ذات میں ڈبو دیتا ہے تخیل اور جذبے کے حسن کے ساتھ ذہن و دل میں ٹھاٹھیں مارتا سمندر ابل کر احساسات اور دلی واردات کو میٹھے اور شیریں الفاظ کی جادو بھری غنائیت سمیت پشتو غزل کو سونپ دیتی ہیں۔ پشتو غزل کی فدائی بانو اپنی پوری زندگی کو غزل سمجھتی ہیں''۔

ژوندمې دا سے یو غزل دے چې مې چاڼ کړو
نه یئې مطلع ، نه یئې مصرعه، نه یئې مقطع شته

ترجمه:

''(میری پوری زندگی ایک ایسی غزل ہے جس میں مطلع ،مصرعہ یا مقطع سرے سے ہے ہی نہیں)''۔ 11

میرمن بانو مردوں کے اس معاشرے میں عورت سے رکھے گئے معاندانہ رویہ کو کس خوبصورتی سے بیان کرتی ہیں۔

دعزت پټکی خوانانو ته په سرشو
دبانو په برخه تشه لو پټه وه

ترجمه:

(عزت کی پگڑیوں سے جوان نوازے گئے۔ مگر بانو کے حصے میں صرف دوپٹہ آیا)
بانو اپنے تئیں دوپٹے کی بے حرمتی نہیں کرتیں لیکن یہ بتانے کی کوشش ضرور کر رہی ہیں کہ دوپٹے کو پگڑی جتنی وقعت کبھی بھی نہیں دی گئی۔
ایک اور جگہ کہتی ہیں

بانو تر څو به دلور خورد غمه خوب نه درځی
څه به تری جوړ کړې ستاپه سرهم لوپټه پرته ده

ترجمه:

(بآنو!! کہاں تک بیٹی ، بہن کے غموں میں گھلتی رہو گی؟؟ تمہاری محنتوں اور کوششوں کا کچھ نہیں بننے والا کہ تم خود بھی تو دوپٹہ اوڑھے ہوئے ایک عورت ہو!!)

بآنو کی غزل میں فطرت کی عکاسی کا رنگ جھلکتا ہے۔

د فطرت د باغ مالي جوړ زيرے ورکړو

نن کلئی د از غو خوا کښې مو سيدلې

ترجمه:

(فطرت کے باغ کے باغبان نے شاید کوئی مژدہ سنا دیا ہے جو کانٹوں کی اوٹ میں آج کلیاں مسکرا رہی تھیں)

پشتو غزل میں ''پختو'' (غیرت) کا استعمال کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔لیکن بآنو جب غزل میں پختو'' استعمال کرنے پر آتی ہیں تو پشتو نولی کا ذکر بڑے جوش و جذبے سے کرتی ہیں کہ ان کے بیان کا ازا عجازی ہو جاتا ہے اور ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ بآنو غیرت کے مفہوم سے پوری طرح واقف ہیں اور رت کی دلدادہ بھی۔

دپښتې دپت پښتو نه ګله !!

پاس په پښتون خلمی پټکی کښې اوسه

ترجمه:

(پشتون دوشیزہ کے اعتماد کے پشتون پھول!۔پشتون جوان کی پگڑی میں سب سے اوپر اور نمایاں نظر آؤ!!)

ماخود مينې په قانون ګله ته او بيئللې

وايه اوس ته مې دپښتوپه زور ګيټې او که نه ؟

ترجمه:

(میں تو تمہیں محبت کے قانون سے ہار چکی ہوں!۔اب یہ تم پر منحصر ہے کہ مجھے پختو (غیرت) کے زور پر جیتتے ہو یا نہیں؟؟)

راشه زماد دخنې ګل شه ګله!!

دغیرت لنبې راته تاکښې بنکاری !!

ترجمه:

(آجاؤ میرے کاکل کے پھول بنو! مجھے تو تجھی میں غیرت کی نشانیاں نظر آرہی ہیں)

محترمہ بانو کو زندگی سے جتنا پیار ہے وہ ان کی نثر اور نظم دونوں سے عیاں ہے۔جیو اور جینے دو کے اصول سے چمٹی ہوئی ہیں۔وہ ایک عملی اور متحرک خاتون ہیں۔ان کی زندگی کا اپنا ایک اصول ہے. کہتی ہیں۔

Be good to all but trust no one!

اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ وہ دنیا کو اعتماد سے عاری سمجھتی ہیں۔مگر شاید یہ انکا ذاتی تجربہ ہو جوایسا کہہ رہی ہیں۔

گرانه دادہ د ملګرو هسې نه ئیمه
زه زړه وره ئیم زړه ماتې مې لسبنکردې

ترجمه:

(مشکل تو یہی ہے کہ میں اپنی ہمنشیوں جیسی نہیں ہوں۔میں با حوصلہ ہوں اور وہ کم ہمت ہیں۔)

میرمن بانو جس طرح کی زندگی گزارنے کی متمنی ہیں درج ذیل شعران کی اس تمنا کا مظہر ہے۔

مادژوندی احساس میرمن کړه نورڅه مه راکوه
زه په بیداره د ژوندهور کښې سوز یدل غواړمه

ترجمه:

{(اے اللہ!!) تجھ سے اور کچھ نہیں مانگنا !!۔۔۔۔بس مجھے زندہ احساس کی مالک بنا۔میں تو زندگی کی آگ میں بھی بیداری کے عالم میں جلنا چاہتی ہوں}

افضل رضا صاحب ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

''محترمہ بانو کی غزل صرف حسن وعشق کے معاملات اور قلبی واردات تک محدود نہیں ہے بلکہ انہوں نے فکری لحاظ سے پشتو غزل میں دوسرے موضوعات کو بھی جگہ دی ہے۔تغزل ہے کہ اختصار،ان کی غزلوں میں موجود ہے۔کسی غزل کی

شیریں زبان کی کمی بانو کی غزلوں میں کبھی کبھار محسوس ہوتی ہے۔ جو زبان انہوں نے اپنے افسانوں میں استعمال کی ہے اگر یہی وہ پشتو غزل کو بھی بخش دیتیں تو ان کی غزل اور زیادہ معیاری ہوتی۔

ان کی غزلوں کے مقابلے میں ان کی نظموں میں زبان کی مٹھاس بدرجہ اتم موجود ہے۔ ڈراموں کے فن میں مہارت کی بدولت ان کی نظموں میں جذبات اور خیالات ان کے جذباتی اور فکری اظہار میں ان کا ساتھ دیتے ہیں۔'' 12

قصہ المختصر۔۔۔ میرمن زیتون بانو نے پشتو غزل اور نظم دونوں میں پشتو زبان و ادب کی خدمت کی ہے رخوب کی ہے جس کو پشتو زبان و ادب کا مورخ کبھی بھی فراموش نہیں کرسکتا۔

بانو کی ڈرامہ نگاری:۔

ڈاکٹر وزیر آغا اپنے مضمون ''کچھ ڈراما کے بارے میں'' میں فرماتے ہیں۔

''ڈرامہ نگار زندگی کے تمام کرداروں کو زیادہ جاندار بنا کر اور زندگی کے عام و اقعات کو زیادہ نمایاں کر کے پیش کرتا ہے تا کہ وہ نگاہوں کا مرکز بن سکیں۔ڈرامے کی کہانی کے انتخاب میں ڈرامہ نگار کو بہت محتاط رہنا پڑتا ہے۔کہانی میں حرکت کی فراوانی اور کرداروں کے تصادم کا موجود ہونا از بس ضروری ہے۔'' 13

''ڈرامہ اور عوام'' کے مضمون نگار' سادھن مکرجی' بتاتے ہیں۔

''جدید ڈرامہ نہ صرف پس منظر کی عکاسی کرتا ہے بلکہ وہ طرز زندگی اور معاشرے کی حالت اور نئے نئے زاویوں سے اس کے مختلف پہلوؤں کا بھی آئینہ دار ہے۔۔۔۔۔ جس قدر صحت وصداقت سے ہمارا فن ہماری زندگی کی عکاسی کرتا ہے اور جتنا وہ زندگی کی گہما گہمی اس کی پیچیدگیوں اور ماحول کو اپنے اندر جذب کرتا جاتا ہے۔اتنا ہی وہ ہمارے اندر ہماری روزمرہ کی حدود سے ماوراقسم کی دلچسپی پیدا کرتا ہے کیونکہ یوں ہم نئی حقیقتوں سے دوچار ہوتے ہیں''۔ 14

(مضمون کے مترجم: سید الابرار)

اپنے تحقیقی مقالے ''دقندھندارہ'' (قند کا آئینہ) میں ڈاکٹر ہمایوں ھماؔ ڈرامے پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک جگہ کہتے ہیں۔

''آج پشتو ڈرامہ جس مقام تک پہنچا ہے یہ سب ریڈیو کے سہارے کے پشتے اور حوصلہ مندی کی بدولت ہوا ہے۔ بعد میں ٹیلی وژن کے پروگراموں کی وجہ سے اس صنف نے عوامی سطح پر کافی مقبولیت حاصل کر لی''۔

''آج کے دور میں پشاور کے ریڈیو اور ٹیلی وژن سے نشر ہونے والے ڈراموں کی تعداد باقی ادبی اصناف کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پشتون لکھنے والوں یا والیوں نے اپنے محدود اور ادھورے وسائل اور ناساعد حالات کے باوجود پشتو ڈرامے کو خاص ترقی دی ہے۔'' 15

1958ء میں زیتون بانوؔ کے پہلے پشتو افسانوی مجموعے ''ھندارہ'' کے تعارف کے بارے میں فرماتے ہیں۔

''بانوؔ چونکہ خود ابھی پڑھ رہی ہے اس لئے اپنے ڈرامے 'خڑہ لفافہ' خاکی لفافہ) کے مکالموں میں 'ذہنی تکلیف'، 'تقریباً'، 'ریٹائیرڈ'، عربی، فارسی اور انگریزی جیسے الفاظ کا استعمال کیا ہے لیکن اگر پڑھے لکھے لوگ بات چیت کریں گے تو ایسے ہی الفاظ کا استعمال ہوگا۔ اسی لئے مجھے بانوؔ کی زبان پسند ہے'' 16

''دپختو ادب زلندہ ستوری'' کے جناب فرمان مسافر کہتے ہیں:

محترمہ زیتون بانو ساری پختونخوا میں ایک شاعرہ کے ساتھ ساتھ ایک افسانہ نگار اور ڈرامہ نویس کی حیثیت سے بھی بہت مشہور ہیں۔ 17

پروفیسر محمد ہمایوں ھماؔ، میرمن زیتون بانوؔ کے ڈراموں کے مجموعے ''کچکول'' (کشکول) کے پیش لفظ میں رقمطراز ہیں۔

''زیتون بانوؔ پشتون لکھنے والوں کے اس گروہ میں ایک نمایاں حیثیت کی مالک ہیں جنہوں نے پشتو ادبی اصناف کو زندہ موضوعات سے متعارف کرایا اور اپنے ادبی تجربات سے ان کو نئی جہتیں عطا کیں۔ ان میں فنی مٹھاس پیدا کی اور اس طرح اپنی محنت اور کاوشوں سے فن کی راہوں میں وہ مشعلیں جلائیں جن کی جوت سے سارا ادبی منظر نامہ روشن ہوا ہے''۔

ایک سچی فنکارہ کی طرح زیتون بانو نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو ایک ہی صنف تک محدود نہیں رکھا ہے
..اس کی تخلیقی ضرورت (Creative Urge) نے اپنے فن کے اظہار کے لئے افسانہ پسند کیا ہے
ڈرامہ، ناول یا غزل ۔ سبھی اصناف میں اس کا پختہ شعور اور زندگی کی حقیقتوں سے بندھے ہوئے زندہ
ضوعات کی تمام تر فنی گہرائی اور حسن صاف نظر آتے ہیں ۔

"ان کے افسانوں کی طرح ان کے ڈراموں کا ہر موضوع، مکالمہ اور ہر کردار ان کے
زندہ احساس اور بیدار ذہن کا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں زندگی کی تلخ و شیریں حقیقتوں
کی عکاسی بھی ہے اور فن کی دلہن کے بناؤ سنگھار کا تمام سامان بھی موجود ہے" ۔18

میر من بانو نے افسانے کی طرح ڈرامہ نگاری میں بھی بڑے خوبصورت تجربے کئے ہیں ۔ بانو صاحبہ
ے ابتدائی دور کے دو ڈرامے "خُوَرہ لفافہ" (خاکی لفافہ) اور "گرم سوک دی" (قصوروار کون؟) ان کی
لی کتاب "ھندارہ" میں چھپ چکے ہیں لیکن یہ ڈرامہ پڑھتے ہوئے کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ
امے کے میدان میں یہ ان کی پہلی کوشش تھی ۔ حالانکہ وہ ٹین ایجر تھیں جب "ھندارہ" مرتب کی تھی ۔
ادبی اصناف کی کسی بھی صنف سے ان کی ابتدائی یا انتہائی کوشش کا پتا چلانا آسان کام نہیں رہا ہے ۔
و کے بقول، انہوں نے نظم نثر دونوں میں کسی سے اصلاح لینے کی ضرورت کبھی بھی محسوس نہیں کی ۔
بانو ادبی مطالعے کے ساتھ ایک صداکار کی حیثیت سے بھی اپنا فنی سفر شروع کر چکی تھیں ۔ ڈراموں
ں خود شرکت کرتی رہیں اور ایک کامیاب ڈرامہ نگار کی خوبیاں سمیٹتی رہیں ۔ کافی عرصہ ریڈیو کی
داکاری، ٹی وی اور سٹیج کی اداکاری اور ادبی ڈرامہ نگاری نے بانو کے لئے پروڈیوسری کے واسطے مہمیز کا
م کیا ۔ انہوں نے کچھ عرصہ ریڈیو میں پروڈیوسر کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے ۔ ظاہر ہے تجربہ فن
ں پختگی اور خوبصورتی پیدا کرتا ہے ۔

فن کی یہ پختگی اور حسن دونوں ان کے ڈراموں میں ضرور موجود ہیں ۔

معاشرے کی اصلاح اور خرابیوں کی نشاندہی میں ڈرامہ ایک مؤثر ذریعہ ہے ۔ پشتون ماحول میں سٹیج
اسب خدمت اس لئے ادا کرنے سے قاصر ہے کہ کسی خاتون کا سٹیج پر عوام کے سامنے آ کر کام کرنے کا
چنا بھی بڑے دل گردے کا کام ہے لہٰذا ریڈیو اور کسی حد تک ٹی وی ہی ایسے دو ذرائع ابلاغ رہ جاتے
ں جن سے فائدہ لیا جا سکتا تھا ۔ چنانچہ بانو نے پہلے ریڈیو کا راستہ اپنایا ۔

بانو کے ریڈیو ڈرامے :

پشاور سٹیشن سے میرمن بانو کے جو ڈرامے نشر ہوئے ان میں فُل لینتھ پلے "نیزہ وڑے" (سیلابی تنکا)، "پاسہ" (خالص سونا)، "خواخوگے" (ہمدرد)، "علاج"، "پرزہ" دبنڑ سویرے (برگد کا سایہ)، "اوم تار" (کچا دھاگہ)، رنڑا گانے" (اجالے)، "مڑہ لفافہ" (خاکی لفافہ)، "گرم سوک دی؟ (قصوروار کون ؟)، "زنزیرونہ" (زنجیریں) اور "دخاورے سلے" (مٹی کا ڈھیر) وغیرہ پشتو ڈرامے شامل ہیں۔

اردو میں "ماں" اور "دستک" ڈرامے نشر ہوئے۔ یہ ڈرامے ظاہر شاہ آفریدی صاحب کی فرمائش پر لکھے تھے اور ان ہی نے پروڈیوس بھی کئے تھے۔

ان ڈراموں کے علاوہ PCI کے تحت طویل دورانیے کا کھیل "خپل غم خپلہ خادی" کے نام سے پورے دو برس تک مسلسل ہر ہفتے قسط وار پشاور سٹیشن سے چلتا رہا۔ یہ ایک Soap Drama تھا۔ جسے UNFPA Radio Drama Project کی مالی معاونت حاصل تھی۔ جسے محترمہ ثریا بجیا لکھتی تھیں پشاور سٹیشن کے لئے سکرپٹ کو پشتون ماحول کے مطابق ڈھالنا اور پشتو میں ترجمہ کرنا محترمہ زیتون بانو کا ذمہ تھا۔ جناب ظاہر شاہ آفریدی "خپل غم خپلہ خادی" (دکھ سکھ اپنا) کے پروڈیوسر تھے۔

صوبہ سرحد میں ٹی وی کی نشریات آنے کے بعد میرمن زیتون بانو نے اس میڈیم کو آزمایا اور نہ صرف ڈرامے لکھے بلکہ ٹی وی پر پہلے ڈرامے میں اداکاری کے جوہر بھی دکھائے بانو نے ڈرامے کا مرکزی کردار ادا کیا تھا۔

بانوؔ کے ٹی وی ڈرامے :

محترمہ بانو کے پشتو میں ٹیلی کاسٹ ہوئے ڈراموں کی تعداد کچھ زیادہ تو نہیں ہے۔ بہرکیف۔ ان میں "زہ لیونئی نہ یم" (میں پاگل نہیں ہوں) "کنکرو" (گھنگرو)، تیکہ (بندی)، "نیزہ ورے" (سیلابی تنکا)، دوئیم مخ (دوسرا چہرہ) زنزیرونہ (زنجیریں)، "دبن سویرے" (برگد کا سایہ) "لمن" (دامن)، "دوہ سترگے" (دو آنکھیں)، "دخاورے سلے" (مٹی کا ڈھیر) وغیرہ ڈرامے بہت پسند کئے گئے۔

ان کے علاوہ ایک فل لینتھ پلے ''سوکھا ساون'' عتیق احمد صدیقی نے پیش کیا تھا اور بانو کے ناولٹ
لبِ آرزو' پر مبنی ایک منی سیریئل 'ڈھول' کے نام سے فرمان اللہ جان نے پیش کی تھی۔ پہلے یہ سیریئل
قسطوں کے لئے ہیڈ کوارٹر سے منظور ہوا تھا مگر بانو کے مطابق ڈھول ڈرامہ ریشہ دوانیوں کا شکار ہوا اور
سات قسطوں میں اسے بعد میں لپیٹنے کی کوشش کی گئی جو ایک ناکام کوشش تھی۔
''ڈھول اور'' سوکھا ساون'' دونوں کھیل اردو میں تھے۔

بانو کے شائع شدہ ڈرامے :

''خوہ لفافہ'' (خاکی لفافہ) اور ''گرم سوک دی'' (قصور وار کون؟) افسانوی مجموعے ''ھنداره''
ئینہ) میں پہلی بار شائع ہو کر داد وصول کر چکے ہیں۔
محترمہ بانو کے ریڈیو اور ٹیلی وژن کے لئے لکھے گئے ڈراموں میں سے چھ ڈرامے علیحدہ سے
موں کے مجموعے ''ټکول'' میں چھپ چکے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔
دنختر ونہ (صنوبر کا درخت)، ''دوئیم مخ'' (دوسرا چہرہ)، پُر زہ۔ٹیک (بندی)، ''دنخوسوریے'' (برگد
سایہ)، ''دخاورے سلے'' (مٹی کا ڈھیر)۔
طالب علمی کے زمانے میں اپنے کالج فرنٹیئر کالج فار ویمن پشاور کے سٹیج پر بانو نے اپنا لکھا ہوا پشتو
بل ''انسان ارزان شو'' (انسان سستا ہوا) جناب فضل حق شیدا کی بیٹی نسیمہ شیدا کی مدد سے سٹیج کیا تھا
میں اوروں کے علاوہ زیتون بانو نے شوہر اور نسیمہ شیدا نے بیوی کے طور پر اداکاری کی تھی۔
محترمہ زیتون بانو کی ڈرامہ نگاری کے متعلق جناب پروفیسر افضل رضا (مرحوم) نے فرمایا ہے۔

ترجمہ :

''پشتو ڈرامے کی تاریخ میں خواتین لکھنے والیوں میں زیتون بانو کا نام غالباً سر
فہرست ہے۔ انہوں نے تقریباً چالیس سال پہلے ڈرامے لکھنا شروع کئے۔ ان کا
یہ 'لکھنا' مرد لکھنے والوں سے اندازاً بیس سال بعد کی بات ہے مگر کتابی صورت میں
اپنے ڈراموں کے چھپوانے میں وہ پھر بازی لے جاتی ہیں اور اولیت کی سند حاصل
کر لیتی ہیں۔ غالباً ریڈیائی ڈرامے تحریر کرنے میں بھی خواتین ڈرامہ نگاروں میں
میرمن بانو کا نام پہلے ہی نمبر پر آتا ہے''۔

اسی طرح ٹی وی کے لئے بھی محترمہ بانو لکھنے والی خواتین میں پہلی خاتون ڈرامہ نویس ہیں جنہوں نے ٹیلی وژن کو کامیاب پشتو اردو ڈرامے دیئے۔

جس طرح افسانوں کے میدان میں محترمہ بانو معیار کے ساتھ گنتی کے لحاظ سے بھی ایک امتیازی اور منفرد مقام رکھتی ہیں اسی طرح ڈرامے میں بھی امتیاز اور انفرادیت کی مالک ہیں۔

> ''بانو ڈرامے کے فن سے کتنی واقف ہیں؟؟۔اس بارے میں کوئی حتمی رائے دینے سے قبل یہ بات غور طلب ہے کہ وہ کافی عرصے تک ریڈیو اور ٹی وی کی چوٹی کی اے ون فنکارہ رہی ہیں۔پھر سونے پر سہاگہ بانو ایک مدت تک ریڈیو پاکستان میں پروڈیوسر کی حیثیت سے فرائض سرانجام دیتی رہی ہیں۔انہوں نے خود ڈرامے لکھے بھی اور دوسروں کے ڈرامے پیش کئے بھی۔اسی لئے ڈرامہ نویسی میں پھلکری لگائے بنا ان کے ڈرامے کا رنگ چوکھا ہی رہا ہے۔'' 19

میرمن زیتون بانو اپنے افسانے کے لئے جو موضوع چنتی ہیں، جس پلاٹ پر اپنی کہانی بنتی ہیں۔وہی Treatment وہ اپنے ڈرامے میں بھی برتتی ہیں۔

ان کے ڈرامے میں بھی ماحول کے تضاد کی کشمکش، محرومیوں کے خلاف صدائیں، معاشرتی مسائل کی دلکش انداز میں پیشکش، بعض ڈراموں میں نفسیاتی گتھیوں کے الجھاوے، غرض سبھی کچھ ملتا ہے۔ موضوعات کے لحاظ سے بانو کے ڈرامے زندگی کی کڑوی کسیلی حقیقتوں کی غمازی کرتے ہیں اور زخمی دلوں پر پھاہے رکھنے کا کام بھی دیتے ہیں۔بانو کے گہرے مشاہدے اور وسیع مطالعے کی جھلک ان کے افسانوں کی طرح ان کے ڈراموں کا بھی طرۂ امتیاز ہے۔

پروفیسر افضل رضا ایک حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ترجمہ۔:

> ''محترمہ بانو کے ڈراموں کے کردار اپنے معاشرے کے زندہ کردار ہیں۔ایک کامیاب ڈرامہ نگار کی حیثیت سے وہ پاسہ، ماجانہ، صبرو، زبیدہ، پروشہ شبو ایسے زنانہ کردار تخلیق کرتی ہیں تو شمروز، خانے۔اسلم، زمان، شعیب کریم جیسے مردانہ کرداروں کی خالق بھی ہیں۔جو ان کے فن کی پختگی پر دلالت کرتے ہیں۔
> ایک کامیاب ڈرامے میں یہ امر بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ ڈرامے کے مختلف واقعات

کا آپس میں ایک دوسرے سے ربط بھی ہو۔ وہ آپس میں گندھے ہوئے بندھے
ہوئے لگتے ہوں اور ان میں ایک پرکشش تعطل بھی موجود ہو، تاکہ ڈرامے کا ناظر یا
سامع محظوظ ہو سکے۔ ہانو نے اپنے ڈراموں میں اس کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔
ڈرامے کی ابتداء عروج اور انجام کی رو سے بھی ان کے ڈرامے معیاری ہیں اور
معیار، مکالموں اور زبان کے لحاظ سے بھی اونچے معیار کے حامل ڈرامے کہلانے
کے مستحق ہیں۔ چونکہ وہ شاعرہ بھی ہے اور افسانہ نگار بھی۔ اور یہی خوبیاں ان کے
احساسات کے اظہار میں ممد ثابت ہوتی ہیں"۔ 20

یرمن بانو کے ریڈیو ڈرامے "دوئیم مخ" (دوسرا چہرہ) اور ٹی وی ڈرامے "پُرزہ" کے چند ترجمہ شدہ
سات درج ذیل ہیں۔

ڈرامہ : دوئیم مخ

(دوسرا چہرہ)

منظر: (ساجدہ اور یوسف باتیں کر رہے ہیں۔ پس منظر میں رات کے تاثر کی موسیقی بج رہی
ہے)

ساجدہ:۔ یوسف!!

یوسف:۔ (ملائم لہجے میں) کیوں؟

ساجدہ: (پیار سے) ایک بات پوچھوں؟؟

یوسف: سو باتیں تو پوچھ سکتی ہو۔ (ذرا وقفہ) بولو نا کیا پوچھنا ہے؟ (ذرا وقفہ)

ساجدہ: (آہستہ سے) میں تجھے اچھی لگتی ہوں؟

یوسف: ہاں!

ساجدہ: کتنی؟

یوسف: بہت زیادہ!!

ساجدہ: تم۔ تم مجھ سے بہت پیار کرتے ہو؟۔ ہیں نا!!

یوسف: خاموش رہتا ہے۔

ساجدہ: کہونا!۔ خاموش کیوں ہو گئے؟؟۔ میں جو تمہیں بہت اچھی لگتی ہوں تو پیار

بھی بہت کرتے ہو گے؟؟

یوسف: (لمبی سانس کھینچ کر) ساجدہ!۔ پیار اور پسند میں بہت بڑا فرق ہے۔

ساجدہ: (چونک کر) یہ کیا کہہ رہے ہو؟؟۔ یعنی۔ یعنی اب تک تمہیں مجھ سے پیار نہیں تھا؟

یوسف: (دھیرے سے) نہیں۔ نہ پہلے تھا اور۔ اور نہ اب ہے۔

ساجدہ: آواز بھرا جاتی ہے) تو!۔۔۔تو!!۔۔ یہ اتنا عرصہ تم نے مجھے دھوکے میں رکھا تھا؟؟۔۔

یوسف: (استقامت سے) نہیں۔۔۔ میں نے کبھی بھی دھوکہ نہیں دیا اور۔۔۔ نہ ہی پیار کے نام سے ورغلایا۔۔۔

ساجدہ: (پھولی ہوئی سانس سے) اور۔۔۔ اور وہ شادی کے وعدے۔ وہ گھر بسانے کے منصوبے؟؟۔۔ وہ پسند کی جگہ پر اپنے گھر کی تعمیر کے وہ خواب؟؟ وہ نہ ختم ہونے والی باتیں!!!۔۔ وہ۔۔ وہ۔۔ کیا وہ سب کچھ جھوٹ تھا؟؟۔ (رونے لگتی ہے)

یوسف: ساجدہ!!۔۔۔ میری سنو۔ تم اتنی جذباتی مت بنو۔ یہ سچ ہے کہ ہم نے ساری زندگی اکٹھے رہنے کی بہت باتیں کی ہیں۔ لیکن میں نے ہر بار محسوس کیا کہ تم۔۔۔ ایک عام سی گھریلو لڑکی ہو۔

ساجدہ: (ہچکیوں سے رو رہی ہے)

یوسف: دیکھو ساجدہ!۔۔ تیری یہ کمزوری مجھے بالکل نہیں بھاتی تم میں کچھ اور باتیں بھی ایسی ہیں جو۔۔۔ جو شاید میری زندگی سے لا گا نہ کھائیں۔

ساجدہ: تو تم چاہتے کیا ہو؟؟

یوسف: میں؟؟۔ میں تجھے بارش کا وہ قطرہ دیکھنا چاہتا ہوں جو برتی دفعہ سمندر میں گرے مگر سمندر کے پانی کا حصہ نہ بنے۔

ساجدہ: (طنزیہ) اور سیپی کے منہ میں داخل ہو۔ اور موتی بنے اور تم اسے اپنی انگوٹھی میں سجا لو!!۔۔۔

یوسف: نہیں۔۔۔بارش کا وہ قطرہ سمندر کے پانی میں علیحدہ سے بہتا رہے۔۔ اپنا تشخص برقرار رکھے اور وقت پڑنے پر زہر کا قطرہ ثابت ہو۔اور اگر کوئی حلق سے اتارنے کی کوشش کرے تو زہر قاتل بنے۔

ساجدہ: (خاموش ہے)

یوسف: سمجھ نہیں سکی نا میری بات؟؟۔

ساجدہ: نہیں۔۔۔قسم لے لو جو ایک بات بھی پلے پڑی ہو۔

یوسف: واضح الفاظ میں سنو!۔۔۔کہ تیری شخصیت محمودہ جیسی ہو۔

ساجدہ: میں جانتی ہوں تم کچھ عرصہ سے محمودہ میں دلچسپی لینے لگے ہو۔

یوسف: کچھ عرصہ سے نہیں۔۔۔میں تو ازل سے محمودہ کی تلاش میں تھا۔اس کی شخصیت دنیا کی دوسری تمام عورتوں سے بالکل مختلف ہے۔

ساجدہ: (نفرت)اس لئے کہ وہ ایک اژدہے کا سا وار کرتی ہے اور باؤلے شیر کی طرح چنگھاڑتی ہے۔

یوسف: اور یہی تو اس کی شخصیت کا اصل جوہر ہے۔

ساجدہ: دیکھو یوسف!۔۔۔محمودہ میری بہن ہے لیکن وہ اتنی ظالم ہے۔اتنی خودغرض ہے اور اتنی حاسدہ ہے کہ تمہاری زندگی کو جہنم بنا دیگی۔۔۔وہ ایک ایسی ناگن ہے کہ تجھے ثابت نگل جائے گی اور ڈکار بھی نہیں لے گی۔

یوسف: !!(شکست خوردہ آواز)یوسف!!۔۔۔محمودہ نے میرے حق پر غاصبانہ قبضہ جمائے رکھا ہے۔اس نے اپنا تبادلہ یہاں اس لئے کروایا ہے کہ وہ تجھے مجھ سے چھین لے۔(روتی ہے)وہ جیت گئی۔میں ہار گئی۔تم خوش ہو تو۔۔۔میں خوش ہوں۔(روتی جا رہی ہے)۔

یوسف: اور اگر تمہاری جگہ محمودہ ہوتی تو وہ کبھی بھی اتنی آسانی سے اپنی ہار نہ مانتی!!۔

ساجدہ: بس کریں یوسف صاحب بس کریں۔میرے زخموں پر اور نمک مت چھڑکیں۔(روتی ہے)دیر ہو رہی ہے۔چلئے اب گھر چلتے ہیں۔

(Change Over)

ٹیلی وژن ڈرامہ : "پُرزہ"

منظر: (ڈیکوریٹڈ کمرہ۔ سرور صاحب اخبار پڑھ رہے ہیں ان کی بیوی مریم کوئی کتاب پڑھ رہی ہیں۔ بیٹی اُمّ سنگھار میز کے سامنے کھڑی کنگھی کر رہی ہے۔ سرور صاحب اور مریم سنگھار میز کے آئینے میں نظر آ رہے ہیں)۔

سرور صاحب: (اُمّ کو شیشے میں دیکھتے ہوئے) اُمّ!!۔۔۔تم نے ایم اے کے لئے داخلے کے فارم یونیورسٹی میں داخل کرا دیئے؟؟۔

اُمّ: (باپ کو دُکھی نظر سے دیکھتی ہے مگر خاموش رہتی ہے)

مریم: (اُمّ کو خاموش پا کر خود جواب دیتی ہے) فارم داخل کرانے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔

سرور: (حیران) کیوں؟؟ بی اے میں نمبر تو بہت اچھے آئے ہیں۔ ایم اے میں داخلہ نہیں لے رہی ہے کیا؟۔

اُمّ: بی اے بھی ممّی کی مرضی سے کیا تھا۔ اب ایم اے میں داخلے کی اجازت بھی ممّی نہیں دے رہی ہیں!!۔

سرور: (وہی حیرانی) ک۔ک۔یوں؟؟؟۔۔۔یہ کیوں؟؟ ممّی اجازت کیوں نہیں دے رہی ہیں؟؟ ایجوکیشن میں دلوا رہا ہوں۔ فیسیں میں بھر رہا ہوں!! پڑھائی کا سارا خرچہ میں اٹھا رہا ہوں۔ ممّی کو کیا تکلیف ہے!!؟۔

مریم: بیٹوں کے بارے میں کبھی بھی بحث نہیں کی۔ مگر اُمّ اور آگے نہیں پڑھے گی۔۔بی اے کافی تھا۔

سرور: (سختی سے) کیوں نہیں پڑھے گی اور؟؟۔۔ایم اے تو خاصا کر لیگی۔

مریم: بیٹیاں پرایا دھن ہوتی ہیں۔ لڑکی نے بی اے تک پڑھا ہو۔ عمر میں چھوٹی لگتی ہے۔ مگر ایم اے کر لے ہر ایک بڑی پھاپھو سمجھتا ہے۔ اور بیٹے بھائی کے لئے مائیں بہنیں بوڑھی کھوسٹ لڑکیاں پسند نہیں کرتیں۔ (فیصلہ کن انداز) بس۔ بی اے کافی ہے۔

سرور: (ہنس کر) چلو!!۔۔۔بھلا یہ کونسی منطق ہوئی؟۔۔۔بی اے کرنے کے بعد کیا یہ ضروری ہے کہ بہن بیٹی بیاہی جائیگی؟؟۔ اور اگر بی اے کے بعد بھی کچھ سال تک اور بیٹھی رہی تو پھر؟؟؟۔۔۔

مریم: بیٹھی بھی رہے تو بھی ایم اے پاس کے مقابلے میں بی اے پاس کی لڑکی چھوٹی ہی سمجھی جاتی ہے۔

سرور: (کڑھ کر) اُمم!!۔۔۔یہ ممی کیا واہیاں تباہیاں مچا رہی ہیں؟؟۔۔۔(بیوی کو)۔یہ کیا پاگل پنا ہے مریم بیگم!!!۔۔۔

مریم: بس ختم کریں یہ بحث۔۔۔ملازمت کرنے بھی نہیں دیں گے۔تو آگے پڑھنے سے فائدہ؟؟۔۔۔

سرور: (گلا صاف کرتے ہوئے) اگر ماسٹر کر لینے کے بعد لکچر شپ مل جائے تو۔ٹائم اچھا پاس ہو سکتا ہے۔

مریم: (فیصلہ کن لہجہ) ٹائم اپنے گھر پر اچھا پاس ہو جاتا ہے۔نوکری کی کیا ضرورت ہے؟؟۔۔۔

مجھ سے کیوں سچ اگلوا رہے ہیں!!اپنی بھتیجیوں کو دیکھیں۔انگلش، پولیٹیکل سائنس اور جانے کن کن سبجکٹس میں ماسٹرز کر چکی ہیں۔

سنا ہے صفیہ، اب پی ایچ ڈی کر رہی ہیں۔سب ماں کے گھٹنے سے چمٹی ہیں۔ان کے مقابلے میں اکبر خان کی بیٹیاں بمشکل میٹرک یا ایف اے کر کے سب اپنے اپنے گھروں کی ہو چکیں۔دو دو تین تین بچوں کی مائیں بھی بن گئیں۔

سرور: وہ تو میرا بھائی کسی کو گھاس نہیں ڈالتا۔جو رشتہ آتا ہے ان میں کیڑے نکالتا ہے۔

مریم: تو مان لیا نا!۔۔۔ایم۔اے کی ڈگری ماں باپ اور لڑکی کے دماغ کو سٹینڈرڈ کے ساتویں آسمان پر پہنچا دیتی ہے۔میں نہیں چاہتی کہ اُمم بھی ہواؤں میں ڈولتی رہے۔بس اتنی پڑھائی کافی ہے!!۔۔۔

اُمم: (باہر گاڑی کا ہارن سنائی دیتا ہے۔سب کی توجہ ادھر ہو جاتی ہے) کتنی دیر کر دی زمان کے بچے نے!!

مریم: کوئی دیر شیر نہیں ہوئی۔تم نے وہاں کونسا لکچر اٹنڈ کرنا تھا۔برتھ ڈے پارٹی ہی ہے نا!!!۔

(اُمم ماں کی بات سن کر کمرے سے باہر نکل جاتی ہے)

مریم: (اونچی آواز سے) اُمم!!۔۔۔میری چادر بھی ساتھ اٹھا لاؤ۔۔۔تجھے سونیا کے گھر تک پہنچا آؤں!۔۔۔

سرور: تم لوگ کتنی دیر مین واپس آ ؤ گی؟؟۔
مریم: صرف اُمم اینوا ئیٹڈ ہے۔میں زمان کے ساتھ واپس آؤں گی۔
سرور: اُمم۔۔۔سونیا کا گفٹ کہاں ہے؟؟۔
امم: اوہ۔۔۔میں تو گفٹ اپنے کمرے میں بھول آئی۔
(اُمم دوڑتی ہوئی واپس جارہی ہے)
سرور: تمہاری باتوں سے کافی ڈسٹرب ہو چکی ہے۔اگر اُمم مزید پڑھنا چاہتی ہے تو میں اس کا ساتھ دوں گا۔
امم: (دور سے) آیئے امی!!۔۔۔سچ مچ کی دیر ہو رہی ہے۔
(ماں بھی باہر نکل جاتی ہے)

۔۔۔کٹ۔۔۔

ناول نویسی:

میر من زیتون بانو کا مشن اگر چہ معاشرتی برائیوں کے سد باب میں اپنا حصہ دینا تھا جس کے اظہار کے لئے انہوں نے افسانے کی صنف چنی مگر اس حساس کہانی کار نے جب محسوس کیا کہ وہ حیاتِ انسانی کے گوں ناگوں حالات و کیفیات کو فن کے سانچے میں ڈھالنے کی صلاحیت رکھتی ہیں تو شاید کسی عزیز خیر خواہ کے کہنے پر یا شاید خود ہی اپنے ذہن رسا سے فیصلہ کیا کہ کیوں نہ ناول جیسی سنجیدہ صنفِ ادب کو اظہار کا ذریعہ بنایا جائے۔اور ہم دیکھتے ہیں کہ یہ بے لاگ افسانہ نگار ناول میں بھی کامیابی کے جھنڈے گاڑھے نظر آتی ہیں۔
زیتون بانو کا پہلا ناول ''برگِ آرزو'' 1984ء میں اردو میں شائع ہوا۔یہ پشاور ٹیلی وژن پر ''دھول'' کے نام سے ڈرامے کی صورت میں قسط وار پیش ہو چکا ہے۔''دھول'' سات اقساط پر مشتمل منی سیریل تھی۔
اس کے علاوہ آپ کا ایک اور ناول ''مہتابہ'' بھی قابل ذکر تحریر ہے جو پشتو میں ہے۔

بانو بحیثیت مدیرہ:

محترمہ بانو کی ہمہ جہت شخصیت کا ایک اور رخ ایک کامیاب مدیرہ کا بھی ہے آپ کئی ایک مقامی اور ملکی سطح کے رسائل و جرائد کی ادارت کرتی رہی ہیں۔رسالہ ''قند'' مردان کے آخری دور کے دو پشتو

کی رکن رہی ہیں۔

مذکورہ تمام جہتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ میرمن زیتون بانو خداداد صلاحیتوں کی مالک ہیں ان کے فن اور شخصیت میں مکمل ہم آہنگی موجود ہے۔ انہیں خالق کائنات نے اظہار فکر اور اظہار خیال کی خوبی عطا کی ہے اور اپنی اس خوبی کو انہوں نے بخوبی استعمال کر کے ادب کے باغ کی آبیاری کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اور بالخصوص پشتو ادب کی خدمت میں اپنا کردار پوری ایمانداری اور سچائی سے ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی ادبی خدمات کے تذکرے کے بغیر پشتو ادب کی تاریخ مکمل نہیں کہلائی جا سکتی۔

میرمن بانو کی ادبی حیثیت کی بابت اباسین یوسفزئی کہتے ہیں۔

"د جدّت اؤ ندرت ، معیار ا ومقدار په ډګر دا په پښتنو ښځو کښې د ټولـو نـه لویه لیکواله ښکاری. هغه که د دوئـی افسانه ده، ډرامـه ده اؤ کـه شـاعری ده. په خپل لیک کښې دا کله د مور په رنګ کښې غږیږی، کله د خور په خوله و ئیږی او کله د محبوبې یا کورودانې په شکل کښې ښکاری. که چرې مونږ د جنـس د قید نه آزاد د دې محترمې د لیک (نثر او نظم دواړو) جـاج اخـلـو نـو پـه مجموعی توګه هـم مونږ دا د خپل دور د لیکوالو په صف کښی په یو څو عظیمو لیکوالانو کښې ولاړه وینو.(21)

ترجمه:

" جدت اور ندرت ، معیار اور مقدار کے حوالے سے بانو پشتون خواتین لکھاریوں میں سب سے قد آور ہیں۔ خواہ وہ ان کے افسانے ہوں، ڈرامے ہوں یا شاعری۔ اپنی تحریروں میں یہ کبھی ماں کی زبان سے بولتی نظر آتی ہیں، کبھی بہن اور کبھی محبوبہ یا بیوی۔ اگر ہم جنس کی قید سے آزاد ہو کر محترمہ کی تحریر (نثر اور نظم دونوں) کا جائزہ لیں تو انہیں اپنے دور کے عظیم لکھاریوں میں پاتے ہیں۔۔۔"

میرمن زیتون بانو سے پہلے پشتو ادب میں اس معیار کا تخلیقی کام سامنے نہیں آیا۔ ایسے ہی لکھاریوں کو

کی رکن رہی ہیں۔

مذکورہ تمام جہتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ میرمن زیتون بانو خداداد صلاحیتوں کی مالک ہیں ان کے فن اور شخصیت میں مکمل ہم آہنگی موجود ہے۔ انہیں خالق کائنات نے اظہار فکر اور اظہار خیال کی خوبی عطا کی ہے اور اپنی اس خوبی کو انہوں نے بخوبی استعمال کر کے ادب کے باغ کی آبیاری کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اور بالخصوص پشتو ادب کی خدمت میں اپنا کردار پوری ایمانداری اور سچائی سے ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی ادبی خدمات کے تذکرے کے بغیر پشتو ادب کی تاریخ مکمل نہیں کہلائی جا سکتی۔

میرمن بانو کی ادبی حیثیت کی بابت اباسین یوسفزئی کہتے ہیں۔

" د جدّت اؤ ندرت ، معیار ا ومقدار په ډګر دا په پښتنو ښځو کښې د ټولـو نـه لویه لیکواله ښکاری. هغه که د دوئـی افسانه ده، ډرامـه ده اؤ کـه شـاعری ده. په خپل لیک کښې دا کله د مور په رنګ کښې غږیږی، کله د خور په خوله و ئیږی او کـله د محبوبې یا کورودا نې په شکل کښې ښکاری. که چرې مونږ د جنـس د قید نه آزاد د دې مـحترمې د لیک (نثر او نـظم دواړو) جـاج اخـلـو نـو پـه مـجموعی توګه هـم مونږ دا د خپل دور د لیکوالو په صف کښې په یو شو عـظیمو لیکوالانو کښې ولاړه وینو.(21)

ترجمه :

" جدت اور ندرت ، معیار اور مقدار کے حوالے سے بانو پشتون خواتین لکھاریوں میں سب سے قدآور ہیں۔خواہ وہ ان کے افسانے ہوں، ڈرامے ہوں یا شاعری۔ اپنی تحریروں میں یہ کبھی ماں کی زبان سے بولتی نظر آتی ہیں، کبھی بہن اور کبھی محبوبہ یا بیوی۔ اگر ہم جنس کی قید سے آزاد ہو کر محترمہ کی تحریر (نثر اور نظم دونوں) کا جائزہ لیں تو انہیں اپنے دور کے عظیم لکھاریوں میں پاتے ہیں۔۔۔"

میرمن زیتون بانو سے پہلے پشتو ادب میں اس معیار کا تخلیقی کام سامنے نہیں آیا۔ ایسے ہی لکھاریوں کو

انہوں نے کئی مقالے لکھے، ادبی جلسوں میں پڑھے، ریڈیو پر سنائے اخبارات ورسائل میں چھپوائے۔

''پشتو زبان وادب میں افسانے کا مستقبل'' مقالہ ''قلم قبیلہ'' نامی محترمہ ثاقبہ رحیم الدین کی ادبی تنظیم کے تحت کوئٹہ میں پڑھا۔ پروگرام کا نام ''شامِ افسانہ'' رکھا گیا تھا۔ اس میں ملک کے نامی گرامی افسانہ نگاروں نے شرکت کی تھی۔

محترم اشفاق احمد اور محترمہ بانو قدسیہ محترمہ کہکشاں ملک جناب منشا یاد اس تقریب کی زینت تھے۔ محترمہ زیتون بانو نے صوبہ سرحد کی نمائندگی کی تھی۔

''پاکستانی معاشرہ اور نئی نسل کی تربیت'' عنوان سے ان کا ایک مقالہ ریڈیو کے پشاور سٹیشن سے نشر ہوا۔

نیز ''پشتو ڈرامے کے مسائل و وسائل'' پر ایک مقالہ پشاور ٹی وی سنٹر کے زیر اہتمام منعقدہ ایک تین روزہ ورکشاپ میں پڑھا جو اباسین آرٹس کونسل کی پرانی بلڈنگ کے ہال میں ہوئی تھی۔ جناب خالد سعید بٹ، جناب کمال احمد رضوی، موئی حمید جیسی شخصیات نے بھی شرکت کی تھی''۔

''د پختو ادب تہ'' (پشتو ادب کا رخ) مقالہ رسالہ اباسین کراچی نومبر 1968ء میں اور ''د پختو ادب رفتار'' (پشتو ادب کی رفتار) مقالہ فروری 1969ء میں چھپے۔ ''ادب دھوا پہ چپو'' (ادب ہوا کے دوش پر) مقالہ اور کئی ایک دوسرے مضامین پشتو ادب کے نثری اور تحقیقی سرمایہ میں اضافے کا باعث ہیں۔

ان کے ساتھ ساتھ ملکی اخبارات ورسائل نے زیتون بانو سے کی گئی بات چیت اور کئی انٹرویوز شائع کیے۔ ان میں انگریزی اخبارات بھی شامل ہیں۔

اس کتاب میں بھی ان کا احمد پراچہ صاحب کا لیا ہوا ایک انٹرویو ''ایک ملاقات۔ چند باتیں'' کے عنوان سے شامل کیا گیا ہے۔

مترجم بانوؔ:

بیسویں صدی کے آغاز میں جدید پشتو شاعری کی ابتداء ہوئی۔ ترقی پسند ادبی تحریک کی تازہ ہوا کے جھونکے پشتون شعراء بھی کسی حد تک محسوس کر چکے تھے چنانچہ شاعری میں مظلوم عورت کو بھی موضوع سخن بنایا گیا۔

پشتو اردو دونوں مشترکہ زبانوں میں چھپی کتاب ''تور سرے'' جس کی ڈاکٹر سلمٰی شاہین نے بڑی عرق ریزی سے تحقیق کی۔ اس کی ترتیب و تدوین بھی کی۔ اس کتاب میں مختلف شعراء اور شاعرات کا پشتو زبان کا وہ منظوم کلام شامل ہے۔ جس میں عورت کے مختلف روپ اور انداز دکھائے گئے ہیں وہ عورت جو

ماں ہے، جو بہن ہے، جو بیٹی ہے، جو بیوی ہے، جو محبوبہ ہے۔ جو مزدور ہے، جو کنیز ہے اور ۔۔۔ جو طوائف ہے۔ شعراء نے اپنے اپنے طور پر ان کرداروں کی عکاسی کی ہے اور بانو نے یہ تمام نظمیں پشتو سے اردو میں منتقل کرنے کی ایک خوبصورت کوشش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ ایک مانی ہوئی نثر نگار اور مستند شاعرہ تو ہے ہی ایک باصلاحیت مترجم بھی ہے۔

بانو کا ''تورسرے'' کا یہ ترجمہ منثور بھی ہے اور منظوم بھی۔ ''تورسرے'' کتاب سے فضل حق شیدا کی پشتو نظم ''خزہ'' کا بانو کا کیا ہوا اردو ترجمہ ''عورت'' کے نام سے ملاحظہ ہو:

شاعر: فضل حق شیدا {اسویلی (آبیں)}

عورت

سیانوں نے آج تک نہ جانا کہ یہ عورت کہلاتی ہے
کیا ہستی ہے؟
کبھی تو یہ ناگن کا روپ دھار لیتی ہے
کبھی پھولوں کا گلدستہ بن جاتی ہے
کبھی کانٹوں بھری جھاڑی
دوا مانگنے جاؤ تو
زہر دے دیتی ہے
اسے مردہ سمجھو تو
بھرپور زندگی ثابت ہوگی
نشہ بھی خود، مدہوشی بھی خود
بے خودی بھی یہی،
میناؤ ساغر کی ہستی بھی یہی
یہی نغمہ بھی بین بنے
کبھی فریاد اور کبھی سرور
اس کی تاروں میں سے رنگ رنگ کی موسیقی ابھرتی رہتی ہے
کبھی تو یہ دوسروں کو آگ لگا کر

خاکستر کردیتی ہے اور پھر
اگلے ہی لمحے خود ہی ہوچکی ہوتی ہے
کبھی تو ایک عظیم پہاڑ جیسی استقامت سے

ایستادہ ہے
یا پھر سیماب صفتی کا مظاہر کرتی ہوئی
ناقرار رہتی ہے
کبھی نار بن جاتی ہے تو
کبھی نور۔۔۔
یہ کیا بھید ہے؟
اس کا یہ جلوہ تو
نہ خاکی ہے اور
نہ ناری۔۔۔۔

''تورسرے'' کے ترجمے کے علاوہ میر حسن باتو نے احمد ندیم قاسمی کے افسانے ''تمز'' اور ''فیشن'' انہی ناموں سے ترجمہ کیئے۔ طاہرہ اقبال کے افسانے ''جونگل'' کا ترجمہ بھی ان کا کارنامہ ہے۔ Pearl S.Buck کے ناول The Good Earth کا ''خوگہ زمکہ'' کے نام سے پشتو میں ترجمہ کر چکی ہیں Fireside Science کو پشتو کا جامہ پہنا چکی ہیں۔ The Peogramate Tree نے بھی ترجمہ ہو کر کافی داد وصول کی تھی۔ باتو نے یہ سارے ترجمے سکول کے زمانے میں کر کے پشتو کے اس وقت کے مختلف رسالوں میں چھپوائے اور پڑھنے والوں نے پسند بھی کیئے۔

بانوؔ کے اعزازات

1۔ شیشم کا پتا

2۔ وقت کی دلہیز پر

3۔ برگِ آرزو وادھول (ان تینوں کتابوں پر اباسین آرٹس کونسل پشاور نے انعامات دیئے)

4۔ 'مات بنگڑی' کو ایم اے (پشتو) کے نصاب میں شامل کیا گیا۔ آج کل اس کی جگہ ''ژوندی غمونہ'' ایم اے (پشتو) کے نصاب میں شامل ہے۔

5۔ 'خوشحال شناسی' ایم اے (پشتو) کے نصاب میں شامل ہے۔

6۔ افسانہ 'دخاورو سلے' بی اے (پشتو) پشاور یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہے اور اس کا اردو ترجمہ 'موم کے آنسو' علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے بی اے کے نصاب میں شامل ہے۔

7۔ ''موم کے آنسو'' کا جرمن زبان میں ترجمہ جناب ڈاکٹر منیر الدین احمد نے کیا ہے اور اسے پاکستانی ادب کے ایک انتخاب میں شائع کرایا ہے۔ (1986ء)

8۔ افسانہ ''اڑان'' کا میتھالی زبان میں ترجمہ ہو کر ہندوستان میں شائع ہوا ہے۔

9۔ افسانہ ''دلشادہ'' بین الاقوامی طور پر منظور شدہ اکٹھی سات زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

10۔ پاکستان ٹیلی وژن کے ڈراما آرٹسٹ کا ایوارڈ۔ سرحد ایوارڈ 1973ء (پاکستان آرٹسٹ ایکویٹی، صوبہ سرحد)

11۔ ریڈیو پاکستان کے ڈراموں میں بہترین صداکاری کا سلور جوبلی ایوارڈ (رائیٹرز ایکویٹی۔ پشاور 1984ء)

12۔ حسنِ کارکردگی بحیثیت ممبر مجلس عاملہ۔ ایوارڈ۔ (اباسین آرٹس کونسل پشاور)

13۔ افسانوی مجموعہ ''خوبونہ'' پر ہجرہ ایوارڈ 1996ء

14۔ چین کا سرکاری دورہ 1989ء

15۔ صدر کا تمغۂ حسن کارکردگی ۔ اردو، پشتو لیٹریچر 1997۔98ء

Presidential Pride of Performance Award

بانو کی وضع قطع اور شخصیت

بظاہر سیدھی سادی، گھریلو نظر آنے والی زیتون بانو سے مل کر محسوس ہوتا ہے جیسے وہ دیو مالائی کہانیوں کی کوئی بوڑھی ساحرہ ہو جس کی پوٹلی میں بے شمار حیران کرنے والی چیزیں بندھی ہوں۔
بانو بڑی بڑی روشن آنکھوں، پر اثر آواز، گلابی شہابی رنگت فراخ پیشانی، ادیبانہ سنجیدگی۔ متناسب قد رکھنے والی ایک غیرت مند، باوقار، اصول پسند، جرأت مند پشتون عورت ہیں۔ جن سے مل کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے زندگی کو بھرپور طریقے سے بسر کرنے کی کوشش کی ہے، اس سے بڑے سبق سیکھے ہیں، تجربہ حاصل کیا ہے۔
وہ ہر چیز اور ہر کام میں انفرادیت چاہتی ہیں۔ ان کی سوچ ایک عام عورت سے قطعی مختلف ہے، وہ تہہ دار شخصیت کی مالک ہیں ہشت پہلو بلکہ ہمہ جہت۔
ان کے لہجے میں ایک خاص قسم کا وقار، بے ریائی۔ سادگی اور گہرائی اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ انہوں نے زندگی کو گزارا نہیں برتا ہے۔ اگر وہ دکھی ہیں تو بولتے وقت آپ کے من کی گہرائیوں میں دکھ درد سرائیت کر جائے گا۔ اگر سکھی ہیں تو آپ کے دل و دماغ پر خوشیاں طاری کر دیں گی۔ ان کے لہجے میں فریب کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ جو کچھ بول رہی ہوتی ہیں وہی کچھ ان کی آنکھوں اور چہرے کے نقوش سے ٹپکتا رہتا ہے۔ مخاطب کرنے کا انداز ایسا، گویا ماں، اولاد سے مخاطب ہو یا استاد شاگرد سے۔ ان کے چہرے کی جھریوں میں زندگی کا فلسفہ بولتا نظر آتا ہے۔
روزمرہ کے معاملات میں نہایت کھری اور دوسروں کے کام آنے والی، جب بھی دوسروں کو تکلیف میں دیکھتی ہیں۔ اپنا آپ بھلا کر مدد کی بھرپور کوشش کرتی ہیں۔
زیتون بانو کے قریبی جاننے والوں کو معلوم ہے کہ وہ نہ کسی کی غیبت کرتی ہیں اور نہ سنتی ہیں۔ لوگوں کے عیب ڈھونڈنے اور پیٹھ پیچھے بولنے میں ان کی عدم دلچسپی ان کے وقار میں مزید اضافہ کرتی ہے۔
باتوں کے دوران ان کا مسکراتے رہنا، بیان میں شوخی پیدا کرنے کے لئے ضرب الامثال، محاورات در چھوٹے چھوٹے واقعات کا کثرت سے استعمال کرنا ان کی خوبی ہے۔ گفتگو کے دوران جب دوسرا بول رہا ہوتا ہے تو یہ غور سے سنتی رہتی ہیں۔ مگر اپنی باری آنے پر اتنی ہی توجہ کی متقاضی ہوتی ہیں۔ سادہ اور

سلیس لہجے میں بہت گہری فلسفیانہ باتیں کر جاتی ہیں۔مخاطب سے شدید اختلاف کے باوجود بھی لہجے میں مٹھاس برقرار رکھتی ہیں۔بولتے وقت ''ہوسکتا ہے، ہونا چاہیے، ایسے لگتا ہے''۔جیسے جملے بہت استعمال کرتی ہیں گویا تنقید کی زبان بول رہی ہوں۔تر کی بہ تر کی کبھی نہیں سناتیں۔اس کے برعکس لکھتے وقت بات براہِ راست ہو یا علامتی۔لگی لپٹی رکھے اور نتائج کی پرواہ کئے بغیر یوں کھری کھری لکھ جاتی ہیں کہ پڑھنے والا پڑھے اور متفق ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا۔

بانو کی اس خاصیت کا اعتراف خاطر غزنوی صاحب ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''زیتون بانو علامت نگار نہیں اسلئے کہ وہ پشتون ہیں اور پشتو میں لکھتی ہیں۔علامت نگاری منافقت کی پیداوار ہے۔پشتون منافقت نہیں جانتا۔22

اب جبکہ ان کی عمر ستر سال ہے۔اب بھی ان کی آواز میں ویسی ہی جوانی، ویسی ہی شوخی اور ویسی ہی ممتا کی رمق موجود ہے جو ہمیشہ سے ان کی شخصیت کا خاصا ہے۔نیز ان کے لکھنے میں ویسی ہی کاٹ اور صداقت موجود ہے جس کے لئے وہ شہرت رکھتی ہیں۔وہ لکھیں تو پڑھنے والے کی خواہش ہوتی ہے کہ پڑھتا چلا جائے اور بولیں تو سننے والا چاہتا ہے کہ بولتی رہیں۔

غرض زیتون بانو اپنے دور کی نہایت کامیاب اور معروف و مقبول اور منفرد ادیبہ ہیں۔ان کی شخصیت بڑی خوبیوں کا مرقع ہے۔اس بات کا اعتراف ان کے مخالفین اور حلیف سبھی کرتے ہیں۔وہ ایک ایسی افسانہ نگار خاتون ہیں جسے نقاد نظر انداز نہیں کر سکتے۔یہ نڈر اور جرأت مند خاتون بہتر مستقبل کی خاطر وقت اور حالات کی جھلسا دینے والی دھوپ میں سالہا سال برہنہ پا چلی ہیں۔ان کی زندگی کوشش و عمل محنت و عزم اور ہمت و استقلال کی ایک طویل داستان ہے۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ پختون ادبی دنیا میں زیتون بانو جیسی فولادی اعصاب کی مالک ادیبہ اب تک سامنے نہیں آئیں جس نے مردانہ غلبہ رکھنے والے معاشرے میں نہ صرف بحیثیت خاتون ادیبہ مردوں کے شانہ بشانہ شمع ادب کو فروزاں رکھا بلکہ پختون معاشرے کے کئی استحصالی رویوں اور صنفی امتیاز کے لاتعداد ناسوروں پر نشتر زنی کی اور غاصبوں کو لمحہ فکریہ فراہم کر کے نظر ثانی پر مجبور کیا ہے۔جیسے اللہ تعالیٰ نے زیتون بانو کو پشتون معاشرے کے اندر طبقاتی اور صنفی امتیاز کے ناسوروں کے لئے نشتر اور دوا بنا کے بھیجا۔خود فرماتی ہیں۔

دزیتون دونی تیل خلقه دارودي
زه زیتون ن الله دوائیم رالیږلي

ترجمه:

(لوگو!! زیتون کا تیل دوا کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اللہ نے مجھے زیتون بنا کے بھیجا۔)

میرمن زیتون بانو کے فن اور شخصیت کے بارے میں نامور نقادان فن کی آراء

کسی بھی فنکار کا قد ماپنے کا آلہ ہم مشرق والے عام طور پر ناقدین کی آراء اور ہم عصر فنکاروں کی دی گئی داد و تحسین کو سمجھتے ہیں گویا جس شاعر ادیب یا کسی بھی فنکار کو جتنا زیادہ موضوع بحث دوسرے لفظوں میں ''قابلِ بحث یا قابلِ ذکر'' سمجھا گیا ہو وہ اتنا ہی بڑا اور عظیم فنکار تسلیم کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ جب کسی سے دشمنی یا رقابت کا جذبہ پالنا ہو تو یا اسے بُرا بھلا کہا جاتا اور ادبی قد کم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے یا پھر محمد حسین آزاد والا طریقہ اپنایا جاتا ہے جنہوں نے استاد داغ کا ادبی قد بڑھانے اور بے چارے مومن کو کوچۂ شعر سے بے دخل کرنے کے واسطے اپنے تذکرے میں سرے سے مومن کا ذکر کرنا ہی گوارا نہ کیا۔

خیر یہ تو ٹھہرا ایک جملۂ معترضہ، لیکن اس تناظر میں ہم دیکھتے ہیں کہ میرمن (محترمہ) زیتون بانو ایک خوش قسمت اور بختاور لیکھک ٹھہرتی ہیں کہ خاتون ہونے کے باوجود اور وہ بھی سرحد جیسے دور دراز علاقے سے تعلق رکھنے والی خاتون، ان کو ملک گیر سطح پر پذیرائی نصیب ہوئی اور ہمیشہ ان کی ادبی خدمات اور فکر و شخصیت کو سراہا گیا کئی مقامی اور قومی جریدوں نے ان کی تحریروں کو نہ صرف جگہ دی بلکہ ان کے فن پر دیگر لوگوں کی تنقید (تعمیری ہو، چاہے تخریبی) اور آراء کو بھی وقتاً فوقتاً شائع کیا جاتا رہا۔ ان کے ساتھ شامیں منائی گئیں۔ ان کے اعزاز میں محافل برپا کی گئیں اور گاہے بگاہے ان کو اعزازات و انعامات سے بھی نوازا گیا گویا ثابت ہوا کہ بقولِ شخصے

''زیتون پتھروں کے دیس میں پیدا ہونے کے باوجود پھولوں کا مقدر پا گئی۔''

کہ پھول کو ہر شخص بقدرِ استطاعت و ظرف سراہتا ہی ہے۔

مرحوم فارغ بخاری اپنے مضمون میں ایک جگہ رقم طراز ہیں۔

''پتا چلا کہ وہ پشتو افسانے بھی لکھتی ہے اب جستجو بڑھی کہ اسے پڑھا جائے بڑی

تلاش کے بعد ایک دو افسانے پڑھنے کو ملے یہ افسانے میری توقعات سے زیادہ اچھے تھے۔ نہ صرف اس کا اسلوب دوسرے پشتو افسانہ نگاروں سے جدا تھا بلکہ تحریر میں بھی ایک نوکیلا پن، ایک نشتریت تھی۔'' 23

معتبر خاتون لکھاری بانو قدسیہ، زیتون بانو کے افسانوی مجموعے ''شیشم کا پتا'' کے حوالے سے لکھتی ہیں۔

''زیتون بانو نے ایک ایسے معاشرے میں جنم لیا ہے جہاں رشتہ داریاں، رسم و رواج قبیلے کی سانجھ اونچی اونچی مٹی کی دیواروں کی مانند ہے، وہاں چاہے سردار ہو، چاہے ایک آنے کا بیٹا، زندگی جرگے کی شکل میں ہے یہاں جذبات پر لیپ پوت کر قبریں تو بنادی جاتی ہیں لیکن اندر ہی اندر لاوا جلتا رہتا ہے اور جب کبھی باہر نکلتا ہے، پستول چلتی ہے آگ لگتی ہے۔ قتل ہوتا ہے۔ یہاں منہ سے نکالے ہوئے ایک وعدے کی پاسبانی یو، این، او کے چارٹر سے زیادہ مستحکم ہوتی ہے، یہاں محبت، نفرت، حقارت، غیرت سب جذبے، جذبے ہیں، ان پہ تعلیم دولت، تہذیب کی راکھ نہیں پڑی۔'' 24

خاطر غزنوی بانو کے فن کے بارے میں اپنی رائے ان الفاظ میں دیتے ہیں۔

''زیتون بانو کی کہانیاں ایک پشتون عورت کے سچے جذبات کی ترجمان ہیں اور پشتون عورت جواب تک دبیز چادر میں لپٹی ہوئی اونچی اونچی مورچہ بند دیواروں کے پیچھے کی ایک مخلوق تھی اور ہے۔۔۔ جس کو دیکھنے کا واحد ذریعہ وہ مورچے ہی ہیں مورچہ بند دیوار تو خیر ڈھے بھی سکتی ہے لیکن دبیز چادر میں لپٹی ہوئی عورت کے ذہن و دل تک پہنچنا صرف اور صرف ایک عورت ہی کا کام ہے جو مورچوں کے راستے نہیں بلکہ ان کی ہم جنس یا ہم صنف ہونے کے رشتے سے ان کے دلوں تک اتر سکتی ہے۔'' 25

ایک انگریزی روزنامہ (Morning News) لکھتا ہے،

"Zaitoon Bano has, thus, brought the hopes and humiliations, the ambitions

and the aspirations of the men and women living in typical pathan surroundings into the main-stream of her first publication in Urdu "Sheesham ka Patta..." This wonderful observer discovered that did not exist for the ordinary eye."

ترجمہ :

زیتون بانو، ایک روایتی پٹھان ماحول میں رہنے والے مردوں اور عورتوں کی امیدوں، احساسات، آرزوؤں اور خواہشات کو اپنی پہلی اردو تصنیف ''شیشم کا پتا'' میں سامنے لائی ہیں، اس منفرد نباض نے وہ دریافت کیا ہے جو ایک عام آنکھ کو نظر نہیں آتا۔

معروف کالم نگار اور مدرس پیشہ نقاد ڈاکٹر ظہور احمد اعوان ''پشتو دنیائے ادب کی خاتونِ اول'' کے نام سے اپنے کالم میں لکھتے ہیں،

''ہر سال زیتون بانو کا نام پرائڈ آف فارمنس کے لیے جاتا ہر سال یہ انعام کسی اور کی جھولی میں پڑ جاتا آخر کار اس سال حقدار کو اس کا حق مل گیا۔۔۔یہ انعام ایک جی دار اور جنگجو خاتون کا ہے جس نے مردوں کے معاشرے کی جکڑ بندیوں کو شکست فاش دے کر نہ صرف اپنے آپ کو آزاد کروایا بلکہ اپنی صنف کی آزادی اور نجات کے لئے مسلسل قلمی جہاد کیا۔''26

سرحد کی ایک اور بیٹی اور ممتاز ادیبہ ڈاکٹر سلمیٰ شاہین لکھتی ہیں۔

''مجھ سے انٹرویو کے دوران اکثر یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ مجھے لکھتے وقت مشکلات، روڑے، کسی رکاوٹ یا کسی قسم کی قدغن کا سامنا تو نہیں کرنا پڑا ہے تو مرا جواب ہوا کرتا ہے ''نہیں'' اس قسم کے کانٹے پتھر تو بانو اپنے زمانے میں اپنے اوپر سہہ چکی ہے۔ ہماری راہ کی تمام رکاوٹیں تو اس نے دور کی ہوئی ہیں

۔اب تو راہیں صاف ہیں اور راستے کھلے ہیں۔'' 27

عبداللطیف پریشان اپنے ایک مضمون میں یوں رقم طراز ہیں۔

''اس نے عورت کی بیچارگی کا گہرا مشاہدہ کیا۔۔۔اسے محسوس ہوا کہ اس کے گرد وپیش میں عورت اپنی ذات کی صلیب اٹھائے ہاتھ پھیلائے کھڑی ہے۔۔۔اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ عورت کی مظلومیت، انسان کی بے بسی اور بیچارگی نے اس کے احساسات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور وہ اس سب کچھ کو اپنے تک محدود نہ رکھ سکی اور اس نے لکھنا شروع کر دیا''۔۔۔اس نے اپنے ماحول و معاشرے کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کیں۔'' 28

ہفت روزہ ''اخبار جہاں'' کے 26 جنوری تا یکم فروری 1987ء کے صفحہ 19 پہ درج ہے۔

''زیتون بانو نے اپنی خوبصورت آنکھوں سے معاشرے کا حسن بھی دیکھا ہے اور دقتِ نظر کے طفیل معاشرے کے چہرے کے داغ بھی دیکھے ہیں۔مثبت اور روشن پہلو بھی دیکھے ہیں اور کریہہ تصویر بھی۔۔۔منفی اقدار بھی دیکھیں اور صحت مند افکار بھی۔پھر پورے خلوص اور سچائی سے ان مختلف النوع عوامل کو قاری تک پہنچایا۔'' 29

سرحد کے علاقے سے تعلق رکھنے والی ایک اور خاتون لکھک محترمہ فوزیہ انجم بانو کی بابت لکھتی ہیں۔

''میں نہیں کہتی کہ بانو کے تمام افسانے شاہکار افسانے ہیں لیکن ان کے افسانوں میں سے اکثر ایسے ہیں جن کو اردو ادب کے بعض اچھے افسانوں کے مقابلے میں لایا جا سکتا ہے۔'' 30

اسی موقع پر جناب پریشان خٹک صاحب فرماتے ہیں۔

''زیتون بانو کا پشتو افسانہ اس لحاظ سے منفرد ہے کہ وہ خود اس صنف سے تعلق رکھتی ہیں جو عام طور پر افسانے کا موضوع بنتی ہے۔۔۔۔بانو اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ افسانوں کا مجموعہ بھی ان ہی کا پہلے چھپ کر آ گیا تھا۔'' 31

ادیب سہیل اپنی تحریر ''شیشم کا پتا ایک تجزیہ'' میں لکھتے ہیں۔

''اپنی چھوٹی زندگی میں بہت حد تک مطمئن اور اسے خوبصورت رکھنے کی متمنی

ہیں۔۔۔یہی وجہ ہے کہ اس کے تمام ناقدوں نے اس کے ہر افسانہ میں کردار
اور ماحول کی سچائی اور خلوص کی گرمی محسوس کی۔زیتون بانو کے افسانے میں کہانی
کا عنصر بھی بھرپور ہے اور خلوص بھی موجود ہے۔" 32

میر من (محترمہ) زیتون بانو کی افسانہ نگاری کی انفرادیت کو جناب اظہر جاوید اپنے جامع، مختصر مگر بھر پور انداز میں بےحد خوبصورتی سے بیان کرتے ہین۔وہ لکھتے ہیں۔

"کچھ چھوٹے چھوٹے واقعات جو روزمرہ زندگی میں جنم لیتے ہیں، عام لوگوں
کی نظر سے چھپے رہتے ہیں مگر زیتون بانو جیسی ذہین افسانہ نگار ان جزئیات
سے زندگی سے بھرپور کہانیوں کی تخلیق کر لیتی ہیں۔" 33 (محفل محفل)۔

محترم اظہر جاوید ہی ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

"زیتون امن کی علامت ہے اور شیشم ٹھنڈی خنک چھاؤں کی اور یوں
زیتون بانو کے افسانوں میں انسانیت سے محبت اور زندگی سے لگاؤ کا پورا
عکس ملتا ہے۔" 34 (کنار راوی)

"شیشم کا پتا" کی تعارفی تقریب کے حوالے سے اسرار زیدی "گوشہ ادب" میں لکھتے ہیں۔

"اپنی تحریروں میں انہوں نے آج کی پشتون عورت کے مسائل کو جس اعتماد اور
حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کیا ہے اسی کے سبب ان کا لہجہ ایک منفرد حیثیت کا
حامل بن گیا ہے ان کی کہانیوں میں سرحد کی معاشرتی زندگی جھلکتی ہے۔ان
کہانیوں میں پشتون معاشرے کی سنگینی اور ملائمت دوش بدوش ملتی ہیں۔ 35

عذرا اصغر اپنے مضمون "زیتون بانو فن اور شخصیت" میں لکھتی ہیں۔

"زیتون بانو مربوط قسم کی فنکار ہیں۔وہ جو دیکھتی ہیں دوسروں کو بھی دکھا
تی ہیں۔جو محسوس کرتی ہیں بلا جھجک کہہ دیتی ہیں۔وہ عورت کی عظمت کی
قائل ضرور ہیں مگر اس عظمت کا بھرم رکھنے کے لیے جھوٹ نہیں بولتیں۔
اس کی خامیوں پر پردہ نہیں گراتیں۔ 36

پشتو کی نوجوان ادیبہ سیدہ حسینہ گل لکھتی ہیں۔

"محترمہ زیتون بانو نے پشتو افسانے میں نئے تجربات کئے۔انہوں نے پشتو

افسانے کو روایتی موضوعات سے باہر نکالا۔ اور پہلی بار اپنے افسانوں میں نئے موضوعات کو نئے انداز سے شامل کیا۔ بعد میں ان کی اس کوشش پر کافی تنقید بھی ہوئی مگر پشتو افسانے میں جدید رجحانات کی بناء پر ایک نئی تبدیلی دیکھنے کو ملی"۔ 37

اردو کے نامور اور قد آور نقاد شہزاد منظر اپنے آرٹیکل "تنقیدی جائزے" میں یوں رقم طراز ہیں۔

"زیتون بانو پشتو کے ان چند گنے چنے افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنہوں نے پشتو کے افسانوی ادب کو ترقی دینے میں بہت اہم حصہ لیا ہے۔ خصوصاً پشتون عورت کی کہانی کو بہت ہی دردمندی سے لکھا ہے"۔ 38

مقبول کاشمیری زیتون بانو سے لئے گئے ایک انٹرویو کے دوران لکھتے ہیں۔

"زیتون بانو کی شخصیت ایک ایسے چراغ کی مانند ہے۔ جس کا مقصد جہالت کے اندھیرے غاروں میں روشنی پھیلانا ہے۔ اس نے قوم کے بچوں کو تعلیم کی روشنی سے بہرہ ور کرنے کے ساتھ ساتھ مجبور و بے بس خواتین کو اور ان کی زندگی کے سمٹتے پھیلتے اندھیروں اور اجالوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ 39

محترم اظہر سعید خان ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"ان کے افسانوں کے موضوعات درد مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں انسانی دکھ درد، سماجی ناانصافی اور رسم و رواج کی قید و بند کے مسائل سادہ اور دل نشین انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔" 40

بانو کی افسانہ نگاری کے بارے میں مسعود احمد بھٹی اپنی رائے کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں۔

"پڑھنے والے کو شدت سے احساس ہوتا ہے کہ انسانی مسائل کی نوعیت ہر جگہ ایک جیسی ہے۔ دکھ کی کوئی سرحد نہیں، درد کا کوئی علاقہ نہیں، مسرت کی کوئی زبان نہیں اور یوں تجربے کی ہم آہنگی علاقائی بعد کو ختم کر کے ذہنی قُرب کی بنیاد رکھتی ہے۔ 41

جناب منصور قیصر اپنے مخصوص بے تکلف انداز میں لکھتے ہیں۔

"زیتون بانو کی ذات جمود شکن ہے بلکہ ہمہ وقت آمادۂ بغاوت ہے۔ وہ تبدیلی چاہتی ہے۔ ہر اس دائرے میں جہاں زندگی زنگ آلود ہوگئی ہو یا فکر کو پھپھوندی

لگ گئی ہو۔ 42

مشہور ادبی شخصیت اور ڈرامہ نگار مرزا ادیب بانو کی فنِ افسانہ نگاری سے متعلق لکھتے ہیں۔

''انھوں نے اپنی کہانیوں کے لیے واقعات کا وسیع کینوس استعمال نہیں کیا۔ ان کے ہاں کینوس چھوٹا ہے لیکن اس کینوس پر انھوں نے جتنے خطوط بھی ڈالے ہیں، وہ بڑے گہرے ہیں۔۔۔۔ انسانی جذبات و کیفیات کی طرح ان کے افسانے بھی رنگا رنگ اور بوقلموں ہیں۔ 43

برصغیر کے مشہور و معروف شاعر اور افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی، بانو کے افسانوی مجموعے ''شیشم کا پتا'' کے بارے میں کہتے ہیں۔

''میں سمجھتا ہوں کہ سرحد کی معاشرت کی جو عکاسی اور نمائندگی زیتون بانو صاحبہ نے کی ہے وہ فکشن کی دنیا میں قطعی منفرد ہے۔۔۔

(دس نمبروں میں سے میں اسے دس نمبر دیتا ہوں)۔ 44

محترم احمد پراچہ اپنی تالیف میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''زیتون بانو کے فن میں گہرائی اور گیرائی پائی جاتی ہے۔ ان کا شمار ایسے ہی ادیبوں میں ہوتا ہے جنہیں کسی تعارف کی ضرورت نہیں ہوتی وہ دوسروں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کی تمام تر خوبیاں رکھتی ہیں۔۔۔ بانو نے پشتو افسانے کو نیا اسلوب، تیکھا لہجہ اور عمدہ انداز بیان دیا ہے اور پشتو افسانے کی حقیقت نگاری کی تحریک کو آگے بڑھایا ہے۔۔۔ ان کی فنی سچائیاں انسان کے انفرادی اور اجتماعی احساس پر مہمیز کا کام کرتی ہیں۔'' 45

بانو کے افسانوں کے حوالے سے فتح محمد ملک لکھتے ہیں۔

''زیتون بانو معاشرے کے باطن تک اتر کر اس کے وجود کا ایک حصہ بن کر حقیقت نگاری کا جادو جگاتی ہیں۔ 46

بقولِ جیلانی کامران۔

''زیتون بانو کے افسانے کائنات پر پھیلے انسانی دکھ کی روداد سناتے ہیں وہ دکھ کو محدود معنوں میں استعمال نہیں کرتی بلکہ دکھ ان کے نزدیک ایک گھمبیر

علامت بنتا ہے۔'' 47

نامور نقاد اور اردو ادب کے مؤرخ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں۔

''زیتون بانو کے افسانوں میں پاکستان کے شمال مغربی علاقے کی روح سانس لے رہی ہے''۔ 48

زیتون بانو کے اردو افسانوں کے مجموعے ''وقت کی دہلیز پر'' کے بارے میں ڈاکٹر آغا سہیل فرماتے ہیں۔

''سرحد کا وہ معاشرہ جو پچاس اور نوے فیصد دیہی آبادی پر مشتمل ہے۔۔۔ بانو اس معاشرے کے مردوں اور عورتوں کی ذہنی تربیت وتہذیب کر رہی ہے۔ وہ جس سمت کی آگہی اور معرفت رکھتی ہے، اس سمت اس معاشرے کو لے جانا چاہتی ہے کہ ادھر روشنی ہے اور صحت مند زندگی کی قدروں کا احساس ہے۔ 49

اردو کے صفِ اول کے نقاد اور مورخ ادب اردو ڈاکٹر سلیم اختر بانو کے بارے میں اپنی منطقی رائے ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

''ایک حساس کہانی کار ہونے کی بنا پر وہ انسانی زندگی کے المیوں کی تصویریں پیش کرتی ہے۔۔۔ بانو کے افسانوں میں انسان ملتا ہے۔ وہ انسان جو اپنے دکھ درد خوشی اور آرزؤں اور تمناؤں میں صرف ایک انسان ہوتا ہے، پنجابی، سندھی، بلوچی یا پشتون نہیں ہوتا۔۔۔ اس نے جس ماحول میں آنکھ کھولی۔ جس معاشرے نے اسے اس کا تشخص عطا کیا اور جہاں کی مٹی سے اس کے وجود کا خمیر اٹھا۔ ان سب کا تقاضا یہی تھا کہ وہ ان کی عکاسی کرتی۔۔۔ بانو صحیح معنوں میں سرحد کی بیٹی قرار پاتی ہے۔'' 50

بین الاقوامی شہرت یافتہ اردو کے مشہور و مقبول شاعر جناب محسن احسان بانو کے افسانوں کے بارے میں رائے رکھتے ہیں کہ۔۔۔

''زیتون بانو کی کہانیاں چاروں طرف پھیلی ہوئی زندگی کی دردناک کہانیاں ہیں جن میں لمحوں کے دکھ حرفوں کے آئینوں میں بولتے نظر آتے ہیں۔'' 51

ڈاکٹر اعجاز راہی (مرحوم) جو جدید افسانے کو فروغ دینے کے لئے کوشاں رہتے ہیں اور نئی نئی راہیں

ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ موجودہ دور کے ایک منجھے ہوئے شاعر ادیب ہیں۔ لکھتے ہیں۔

''زیتون بانو نئے آنے والے افسانہ نگاروں میں سے ایک ایسا نام ہے جس نے اپنے فن وفکر کے حوالے سے اپنی الگ پہچان کرالی ہے۔ وہ پشتو افسانے میں جدید رجحانات وامکانات کو روشناس کرانے والی ہیں۔ مگر زیتون بانو کا نام پشتو ادبیات میں صرف اس لئے اہم نہیں کہ وہ پشتو کی جدید منفرد اور باصلاحیت افسانہ نگار ہیں بلکہ انہیں پشتو زبان کی عظمت کا ادراک ہے۔'' 52

پختون ناقدین کی آرا:

ملکی اور غیر ملکی سطح پر شہرت کے حامل اردو شعراء اور ادباء کی ناقدانہ آرا کے ساتھ اگر پشتون اہل قلم کی رائیں بھی دی جائیں تو مناسب ہوگا تاکہ ان کا نکتۂ نظر بھی واضح ہو کہ وہ بانو کے قلم، فن اور کسی حد تک ان کی شخصیت کے بارے میں ہم زبان اور ہم عصر ادیب وشاعر ہونے کے ناطے کیا کہتے ہیں۔

اپنے زمانے کے ثقہ دانشور جناب خیال بخاری پشتو ادب کی رفتار کو پرکھنے والے ایک زیرک اور گہری نظر رکھنے والے محقق تھے۔ بانو کے افسانوں کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ:

بانو ایک تجربہ کار اور سمجھدار افسانہ نگار ہے۔ یہ قدم بہ قدم اوپر کی طرف محو سفر ہے۔ اس کا ہر افسانہ بادی النظر میں بڑا سیدھا سادہ نظر آتا ہے مگر عمیق خیالات اور نفسیاتی نکات لئے ہوئے ہوتا ہے۔ 53

(ڈاکٹر خیال بخاری)

1958ء میں پشتو کے مشہور انقلابی شاعر وادیب جناب عبدالخالق خلیق نے بڑے ہی شیریں انداز میں اپنی رائے ظاہر کی ہے کہتے ہیں کہ:

''زیتون بانو پہلی پشتون دوشیزہ ہے جس نے نثر میں پشتو زبان کی شاندار خدمت کی۔ ''ھندارہ'' کتاب پشتو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔۔۔ایک باپردہ پشتون لڑکی کے قلم سے فن کے تمام لوازمات پر پوری اترتی کتاب ''ھندارہ'' قابل ستائش ہے۔'' 54 (جناب عبدالخالق خلیق)

پشتو اکیڈمی کے سابق ڈائریکٹر پروفیسر محمد نواز طائر، جو بیک وقت شاعر ادیب، مؤلف ومحقق اور

مترجم بھی ہیں رقمطراز ہیں:

بانو معیاری افسانہ لکھنے والوں میں ایک نمایاں نام ہے۔ عوامی زندگی کی عکاسی کرتی ہے اور افسانے کی فنی باریکیوں سے بھی پوری طرح واقف ہے۔55 (پروفیسر محمد نواز طائر)

آج پشتو ادب جن افسانہ نگاروں پر ناز کرتا ہے ان میں زیتون بانو بھی شامل ہیں''۔56

جناب ایوب صابر زیتون بانو کے افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔

''جن فنکاروں نے پشتو افسانہ بام عروج تک پہنچایا اور جدیدیت کے اتنا قریب کیا کہ اب اگر کوئی محقق عالمی مختصر افسانوں پر تحقیق کرنا چاہے تو پشتو افسانوں کے بعض افسانوں کو پرکھے بغیر ان کی تحقیق نامکمل ہوگی اور ان بعض افسانوں میں زیتون بانو کے سارے ہی افسانے شامل ہوں گے۔''57

(ایوب صابر)

ممتاز شاعر اور ڈرامہ نگار پروفیسر ڈاکٹر محمد اعظم اعظم نے اپنی کتاب ''پختو افسانہ'' میں بانو کے فن پر کافی تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''خواتین لکھنے والیوں میں زیتون بانو سب سے زیادہ باشعور اور باقاعدہ لکھنے والی ہے بانو نے پشتو افسانے کے میدان میں عظیم کام کیا ہے۔ ان کی افسانوی کوششیں کئی سالوں پر محیط ہیں۔''۔ 58

(ڈاکٹر محمد اعظم اعظم)

جناب پروفیسر افضل رضا (مرحوم) ایک انتھک محقق اور مخلص دانشور تھے ان کی ادبی مساعی پشتو ادب فراموش نہیں کرسکتا۔ وہ زیتون بانو کی ادبی کاوشوں پر پوری دسترس رکھتے تھے۔ مرحوم لکھتے ہیں:۔

''زیتون بانو کا ادبی سفر کئی تجربوں سے گزر کر فنی منازل طے کر چکا ہے۔ وقت، ماحول کے گہرے مشاہدے اور فنی ریاضت نے ان کی تحریروں میں معیار کا ایک توازن پیدا کیا ہے۔ اس معیار کے ترازو نے بانو کے فن اور شخصیت کو آپس میں یوں جوڑا ہے کہ پشتو کا جدید ادب ان کے ذکر کے بغیر بالکل اُدھورا ہے''۔59

(پروفیسر افضل رضا)

''دقتدھندارہ'' پروفیسر ڈاکٹر محمد ہمایوں ہما کا وہ مقالہ ہے جس پر ان کوڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی ہے۔ باتو کے فن پر ان الفاظ میں اظہار خیال کرتے ہیں:

> بنیادی طور پر زیتون بانو افسانے کی لکھاری ہیں۔ ان کا شمار پشتو افسانے کے ان لکھنے والوں میں ہوتا ہے جنہوں نے شعوری طور پر یہ صنف اپنائی اور ان کا یہ سفر سالوں پر پھیلا ہوا ہے۔
>
> (پروفیسر ڈاکٹر ہمایوں ہما)

ان تمام اشخاص کی آرا کی روشنی میں دیکھا جائے تو محترمہ زیتون بانو بلاشبہ ایک کامیاب اور صاحب کمال لکھک کے طور پر سامنے آتی ہیں جس نے اپنی پرخلوص تحریر کے ذریعے سرحد میں بسنے والے انسان کو ادب عالیہ سے متعارف کرانے میں اپنی سی کوشش انجام دی اور اس میں کامیاب بھی رہی۔ اور اس خطے کی خواتین لکھاریوں کے لیے راستہ کھول دیا جس پہ چل کر نئی منزلوں کی دریافت کوئی مشکل یا کم از کم ناممکن کام نہیں۔ کاش کہ سرحد کی زمین اس ایک شاخ زیتون پر قانع نہ رہے بلکہ اس ٹہنی سے نئے نئے شگوفے پھوٹیں جو شاخ در شاخ ایک تناور درخت کی صورت گری کر جائیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر

بانو جی

میں مضمون کے آغاز میں ہی اعتراف کرنے پر مجبور رہوں کہ زیتون بانو کا فن میری نفسیاتی تنقید کی گرفت میں نہیں آسکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں تخلیقات کی روشنی میں تخلیق کار کی شخصیت کی تحلیل نفسی کرتا ہوں۔ اس مقصد کے لئے مجھے تخلیق کار کی ذاتی زندگی کے بارے میں خفیہ قسم کی معلومات درکار ہوتی ہیں اس کے EMOTIONAL پرابلم جاننے ہوتے ہیں۔ اوران کے علاوہ اس کی محرومیوں سے لے کر کجرویوں تک ہر چیز کی F.I.R بھی میرے پاس موجود ہونی چاہئے۔ تب میں فن اور شخصیت کا مطالعہ کرسکتا ہوں۔ اس لئے میر اور میرا جی کے بارے میں لکھنا آسان ہے۔ لیکن زیتون بانو کے بارے میں کتنا مشکل ہے۔ اے کاش! یہ تھوڑی سی ABNORMAL ہوتی وقتاً فوقتاً تاج سعید کی بے عزتی کرتی رہتی بلکہ زیادہ جنون میں آ کر اسے گھر سے بھی نکال دیا کرتی۔ اس کی تیز گفتاری کے چرچے زمانہ بھر میں ہوتے۔ خود چشم نما ہوتی لیکن دوسروں پر چشمک زنی کرتی۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ زیتون بانو میں یہ تمام نفسیاتی خوبیاں موجود نہیں ہیں۔ چند برس بشیر ابصار عبدالعلی کی کتاب کی تقریب میں شرکت کے لئے جب ہم پشاور گئے تو طاہر تونسوی اور سنگ میل کے نیاز احمد ہم سب ان ہی کے مہمان تھے ان چند دنوں میں مجھے یہ مشاہدہ کرنے کا موقع ملا کہ زیتون بانو کتنی سگھڑ بیوی ہے دونوں میاں بیوی میں باہمی افہام و تفہیم پر مبنی ایسا حسن سلوک پایا جاتا ہے۔ جس سے گھر کی فضا جنت بنی رہتی ہے۔ وہ اپنے بچوں سے والہانہ پیار کرتی ہے۔ اور پٹھانوں والی روایتی مہمان نوازی کی خصوصیات بھی رکھتی ہے کہ ہم سب لوگ بلا اطلاع بے وقت کی بارش کی مانند ان پر نازل ہوئے تھے۔ لیکن اس نے اپنے لذیذ کھانوں اور خلوص سے ہمیں موہ لیا۔

زیتون بانو ایک حد درجہ کی نارمل عورت ہے اسی لئے وقت کی دہلیز پر ایک نارمل قلم کار کی نارمل کہانیاں

ہیں۔ سادہ اور بس بالکل ایسے جیسے وہ اپنے بچوں کو کہانیاں سنا رہی ہو یا پھر تاج سعید سے محلّہ کی عورتوں کی حکایات بیان کر رہی ہو۔

جہاں تک زیتون بانو کی تخلیقی شخصیت کا تعلق ہے تو وہ بنیادی طور پر پشتو کی قلمکار ہے۔ اب اپنی پشتو کا یہ عالم ہے کہ دو سال پشاور میں رہنے کے باوجود بھی ہم پشتو نہ سیکھ پائے اور عوامی رابطے کی بناء پر جو چند الفاظ سیکھے تھے۔ تو اس قابل نہیں کہ شرفا کی اس محفل میں سنائے جا سکیں۔ وقت کی دہلیز پر زیتون بانو کے پشتو افسانوں کا اردو روپ ہے۔ لیکن جہاں تک زیتون بانو کے طرز احساس کی تشکیل یا زندگی کو دیکھنے والے زاویوں کا تعلق ہے تو یہ محض پشتو سے مخصوص قرار نہیں دیئے جا سکتے کیونکہ ایک حساس کہانی کار ہونے کی بنا پر وہ انسانی زندگی کے المیوں کی تصویریں پیش کرتی ہے۔ جس میں زیتون بانو کے افسانوں میں ایسا انسان ملتا ہے۔ وہ انسان جو اپنے دکھ درد خوشی اور آرزوؤں اور تمناؤں میں صرف ایک انسان ہوتا ہے۔ پنجابی، سندھی، بلوچی یا پشتون نہیں ہوتا۔ یوں اس کے افسانوں کو دیکھیں تو ان میں پاکستان اور اس کے عوام کی روح زندہ اور بیدار نظر آتی ہے اب یہ دوسری بات ہے کہ زیتون بانو کے افسانوں کا LOCALE ہمیشہ سرحد اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ بنتا ہے اور اس طرح ہونا ہی درست ہے کیونکہ اس نے جس ماحول میں آنکھ کھولی۔ جس معاشرے نے اسے اس کا تشخص عطا کیا۔ اور جہاں کی مٹی سے اس کے وجود کا خمیر اٹھا۔ ان سب کا تقاضا یہی تھا کہ وہ ان کی عکاسی کرتی۔ ان کے آئینہ میں خود کو پہچانتی اور اپنے فن کے آئینے سے ان کی شناخت کراتی۔ یوں دیکھیں تو زیتون بانو صحیح معنوں میں سرحد کی بیٹی قرار پاتی ہے۔ ''وقت کی دہلیز پر'' بندر کی قبر، گونگے جن ''صوابے''، ''پگلی''، ''کلدار'' وغیرہ اس مجموعے کے چند افسانے ہی نہیں بلکہ یہ ایسے زاویے بھی قرار پاتے ہیں۔ جن کی مدد سے ہم سرحد کے عوام اور بالخصوص سرحد کی بیٹیوں کی شخصیت کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی وقت کی دہلیز'' پر ایک ایسا موذیک ہے جو سرحد کی زندگی، سوچ، حیات اور فکر کی متحرک تصویریں پیش کرتا ہے۔

میں نے ابتدا میں یہ کہا تھا کہ زیتون بانو ایک نارمل عورت ہے تو اس کا اندازہ وقت کی دہلیز پر افسانوں کے مطالعے سے بھی ہو جاتا ہے کیونکہ اس کتاب میں بعض افسانے ایسے بھی ہیں جہاں وہ سنسنی خیزی پیدا کر سکتی تھی۔ اپنے قارئین کو چونکا سکتی تھی ۔ جبکہ ٹوپی میں سے خرگوش نکالنے کا کرتب بھی دکھا سکتی تھی۔ لیکن اس نے ہر موقع پر ایسا کرنے سے احتراز کیا ہے۔ مثلاً افسانہ ''گونگے جن'' کو لیں۔ میں نے جب یہ افسانہ پڑھنا شروع کیا تو بہت خوش ہوا کہ چلو زیتون بانو اپنا گھریلو ماحول چھوڑ کر عصمت چغتائی والے ہسٹریا کی دنیا میں آ رہی ہے۔ ''گونگے جن کی چاچی جو کہ افسانے کا مرکزی کردار ہے اس پر جنوں کا سایہ ہے اور وہ بھی گونگے جنوں کا زیتون بانو نے چاچی کے جنون کی جو تصویر کشی کی ہے وہ نفسیاتی لحاظ سے بہت مکمل ہے۔ سرخ کپڑوں کو دیکھ کر اس پر دورہ پڑتا ہے بہت معنی خیز ہے۔ سرخ رنگ میں

معنویت کے جو گہرے اشارے پوشیدہ ہیں۔ میں انہیں واضح کرنے کی جرأت نہیں رکھتا کہ زمانہ ایسی باتوں کا نہیں ہے جوں جوں چاچی کے دورے اور سرخ رنگ کے گہرے نفسیاتی حوالے استوار ہوتے گئے اور افسانہ آگے بڑھتا گیا میں خوش ہوتا گیا۔ لیکن اختتام کے قریب زیتون بانو نے جیسے چپکے سے ٹھنڈے پانی کی بالٹی اٹھائی اور مجھ پر انڈیل دی۔ میں تو خوش ہو رہا تھا کہ یہ افسانہ ہسٹریا کی کیس ہسٹری میں تبدیل ہو رہا ہے۔ لیکن زیتون بانو نے تو ایک دکھیا ماں کی مامتا کے کرب کی عکاسی کر کے افسانے کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اب ماں کی مامتا والی چاچی کسی ایک خطہ سے وابستہ نہیں کی جا سکتی۔ بالکل اسی طرح جس طرح مامتا کو ہم زبان و مکان میں مقید نہیں کر سکتے۔ یہ افسانہ زیتون بانو کے فن کی اس اہم خصوصیت کی طرف اشارہ کرتا ہے اگر چہ اس کے کردار سرحد سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن زیتون بانو ان کی تصویر کشی اس مہارت سے کرتی ہے کہ وہ صرف سرحد کے نہیں رہتے بلکہ اپنے جذبات اور احساسات کی صداقت کی بنا پر مقامی حیثیت سے بلند ہو کر ایک وسیع تناظر میں نظر آتے ہیں۔ حالانکہ وہی لہر دریائے اٹک پار کرتی نظر نہیں آتی۔ اسی طرح ان کا افسانہ ''بندر کی قبر'' ہے اس افسانے میں بھی زیتون بانو ہماری توقعات کو کسی اور راستے پر ڈالتی ہے اور ہم افسانے کے کسی اور ہی اختتام کے منتظر ہوتے ہیں۔ لیکن زیتون بانو آخر میں ایک خاص فن کاری سے کام لیتے ہوئے اسے آزادی کی تحریک کی داستان میں تبدیل کر دیتی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ آزادی کی تحریک کو بھی کسی ایک خطے سے وابستہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔
اس مجموعے کا ایک اور بہت اہم افسانہ ''وقت کی دہلیز'' پر ہے یہ اسی زبیدہ کی کہانی ہے جو مشرقی عورت کی وفا ایثار و قربانی اور بے پایاں محبت کا مثالی نمونہ ہے جس شخص کی محبت میں گرفتار ہو کر اس نے سب کچھ تیاگ دیا تھا۔ وہ جب بے وفا نکلا تو اس غم نے اسے ''وقت کی دہلیز'' پر پہنچا دیا اور عین اس وقت کہ وہ یہ دہلیز پار کرنے کو تھی اس کی نسوانی روح بیدار ہو جاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ خواب محبت کے فریب نہیں کھا سکتی اسی سے اس میں خود اعتمادی اور جینے کی امنگ پیدا ہو جاتی ہے کہ زبیدہ موت سے نبرد آزما ہو کر نہ صرف اپنی جان بچاتی ہے بلکہ نرس بن کر وہ دوسروں کے لئے بھی شمع امید روشن کرتی ہے۔
زیتون بانو کے فن کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ اسے جہاں بات کہنے کا سلیقہ آتا ہے وہاں وہ بات چھپانے کا گر بھی جانتی ہے ویسے تو یوں عورتیں بات چھپانے اور خاص طور سے دل کی بات چھپانے میں بطور خاص ماہر ہوتی ہیں۔ لیکن زیتون بانو نے جب اس خصوصیت کو اپنے فن میں سمو دیا تو آنکھیں خود فریبی، چاہت اپنے لئے اور نشہ جیسے افسانے تخلیق کئے۔ یہ ایسے افسانے ہیں جو اپنی سادہ بیانی میں بہت کچھ کہہ جاتے ہیں بلکہ ان افسانوں کی دلکشی کا راز ہی اسی میں مضمر ہے کہ زیتون بانو نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ جانے کے گر سے آگاہ ہے۔
زیتون بانو کا فن مسلسل ارتقاء پذیر ہے اس کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 15, 14 برس کی عمر میں شائع

ہوا تھا۔ اسی وقت سے آج تک وہ مسلسل تخلیق کے عمل میں معروف رہی ہے اور یہ ایسا سفر ہے کہ خوب سے خوب تر، جس میں سنگ میل بنتے ہیں۔ ایوب صابر نے اسے پشتو ادب کی خاتون اول قرار دیا ہے اور اس میں کچھ ایسا مبالغہ بھی نہیں کیونکہ خواتین کے ساتھ ساتھ مرد لکھنے والوں میں بھی زیتون بانو ایک الگ اور ممتاز حیثیت کی مالک ہے۔

میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے پاکستانی ادب کا ٹیوٹر ہوں۔ جب نصاب کی کتاب مجھے موصول ہوئی تو یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ اس میں زیتون بانو کا ایک نمائندہ افسانہ ''موم کے آنسو'' بھی شامل تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت بڑا اعزاز ہے کہ زیتون بانو کو بلند قد کی افسانہ نگار سمجھتے ہوئے ملک گیر حیثیت رکھنے والے نصاب میں اس کی کہانی شامل کی گئی۔ جب مجھے طلبہ نے اپنی Assignments ارسال کیں تو ان میں سب طلبہ نے زیتون بانو کے اس افسانے کو بے حد سراہا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی کہانی کار کیلئے یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے کہ ناقدین فن کے ساتھ ساتھ عام قارئین میں بھی وہ یکساں مقبول ہوا گر ایسا نہ ہوتا تو آج ہم سب اسے خراج تحسین پیش کرنے کو یہاں جمع نہ ہوتے۔

(یہ تحریر ''شبنم کا پتہ'' کی تقریب رونمائی میں پڑھ کر سنائی گئی)

رحیم گل

سقراط و بقراط

کہتے ہیں جس طرح سقراط سچائی کی علامت ہے۔ اسی طرح بقراط دانش کی حدیث! سقراط سے میری بہت پرانی راہ ورسم ہے۔ نامہ و پیام میں بھی یہ شخص کھرا، ستھرا اور بے ریا، دنیاداری، رواداری اور وضع داری میں بھی یکتا، میں نے جب بھی راوی کے اس پار سے پکارا، تو اٹک کے اس پار سے اس شخص کی محبت بھری آواز سنائی دی۔

یہ شخص تاج سعید تھا۔ جسے آج کی محفل میں سقراط کہنے کو جی چاہ رہا ہے۔

تو دوستو۔۔۔ سقراط نے ایک بار مجھے خط لکھا۔

بھائی رحیم گل، تم نے جو اردو کے بعد اب پشتو میں بھی فلمیں بنانا شروع کر دی ہیں۔ تو تمہیں آگاہ کیا جاتا ہے۔ کہ میری بیوی زیتون بانو پشتو کی نہ صرف معروف افسانہ نگار ہے۔ بلکہ مشہور شاعرہ بھی ہے لہٰذا اگر تم کہانی اور مکالمے کا بار خود اٹھاتے ہو تو اٹھائے رکھو۔ مگر جان لو۔ کہ تم شاعر نہیں ہو کہ ہر

جگہ ٹانگ اڑاؤ۔لہٰذا اب تم جو بھی فلم بناؤ گے۔تو گانوں کی سچو ایشن لکھ کر بھیج دو۔تا کہ بانو اس پر طبع آزمائی کرے۔

میں نے سوچا۔ستراط ٹھیک کہتا ہے۔چونکہ سرحد کو چھوڑے ہوئے بیس بائیس برس گزر گئے تھے۔اور میں پشتو ادب کی رفتار اور مزاج سے ایک حد تک دور چلا گیا تھا۔لہٰذا میں نے خواہ مخواہ کی معتبری جتانے کے لئے ایک صاحب سے پوچھا۔

''بانو کیسی شاعرہ ہیں۔۔۔؟''

شخص مذکور جس کا نام اس لئے نہیں بتاؤں گا۔کہ نقصان امن کا اندیشہ ہے۔بہر حال اس شخص نے کہا ۔۔۔''بہت بقراط قسم کی عورت ہے!''

اگر چہ یہ فقرہ اپنے لغوی معنوں میں کچھ اتنا زیادہ سخت نہیں تھا۔لیکن جس لہجے میں یہ فقرہ ادا کیا گیا تھا ۔اس سے میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔مگر مجھے تو بہر حال ستراط کا کہا ماننا تھا۔۔

میں نے سچو ایشنز لکھ کر بھیج دیں۔بانو نے گانے لکھے۔اور سچ بتاؤں۔خوب لکھے۔یہ میرا ان سے پہلا غائبانہ تعارف تھا۔۔۔

قتیل کی فلم عجب خان آفریدی کی ریلیز کے سلسلے میں پشاور جانا ہوا۔ایک دن ریڈیو سٹیشن گئے۔تاج سعید کے کمرے میں بیٹھے تھے کہ سفید کوٹ اور سفید سوٹ میں ملبوس ایک ہنستی مسکراتی خاتون اندر آ گئیں ۔ستراط نے تعارف کرایا۔

قتیل صاحب، رحیم گل صاحب، یہ میری بیوی بانو ہے!''

بانو نے ہم دونوں کو آداب کیا۔میں حیرت واستعجاب سے سرخ وسپید، سراپا تبسم، بانو کو دیکھ رہا تھا۔اور پریشان ہو رہا تھا۔کہ اچھا ایسے ہوتے ہیں بقراط!

ان دنوں ستراط بقراط دونوں ریڈیو میں ملازم تھے۔بقراط کا عہدہ ستراط سے ذرا بڑا تھا۔یہ تو خدا ہی جانے یا ستراط جانے۔کہ جب بیوی حاکم ہو اور شوہر محکوم، تو مجازی خدا کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔اور وہ زندگی کو کس طرح برتتا ہے۔؟ لیکن خدا بانو کا بھلا کرے انھوں نے دوران ملازمت ایم اے کر لیا۔اور ریڈیو چھوڑ کر درس وتدریس کے پیشے میں چلی گئیں۔اور یوں دفتری اوقات میں انتھونی کو قلوپطرہ کی حاکمیت سے نجات ملی۔

بر سبیل تذکرہ، بانو کا ریڈیو کی ملازمت چھوڑنے میں بابر کا بھی بہت ہاتھ تھا۔بابر ان کا سب سے چھوٹا

بیٹا ہے۔اور سب کو بہت پیارا ہے۔حالانکہ سقراط بقراط کے سارے بچے پیارے ہیں۔ماں کی ناک اور ماں جیسے دہانے والے بچوں نے مزاج اپنے باپ کا پایا ہے اس لئے سونے پر سہاگہ ہو گیا ہے۔وہ جو برناڈ شا کو کسی ایکٹریس نے کہا تھا۔۔۔۔"آؤ ہم تم شادی کر لیں۔تاکہ جو اولاد پیدا ہو، وہ آپ کا دماغ اور میری شکل لے کر آئے۔۔۔۔۔"

برناڈ شا نے جواب دیا تھا۔۔۔۔۔"اس کی کیا ضمانت، کہ جو اولاد پیدا ہوگی۔اس کی شکل مجھ جیسی اور دماغ تم جیسا نہ ہوگا۔۔۔؟"

تو دوستو۔۔۔۔اگر برناڈ شا زندہ ہوتا تو ہم اس سے کہتے۔۔۔"دوست۔تم سے غلطی ہوئی۔خواہ مخواہ کے مغالطے میں ایک خوبصورت عورت سے ہاتھ دھو بیٹھے۔۔۔"یہ دیکھو۔یہ زندہ مثال، شکلیں ماں پر، مزاج باپ کا۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی بابر کی۔۔۔۔بابر ان دنوں دو ڈھائی سال کا تھا۔یہ لوگ صبح صبح اٹھ کر تیار ہوتے۔جلد جلد ناشتہ کرتے۔بچوں کو تیار کر کے سکول بھیجتے۔اور خود اپنی اپنی ڈیوٹیوں پر پہنچتے۔تو ننھا معصوم بابر پوچھتا۔۔۔"ماں آج مجھے کس کے گھر چھوڑ کر جاؤ گے؟"

تو ماں کا کلیجہ کٹ کٹ جاتا۔کیونکہ یہ روز کا معمول تھا۔بابر روزانہ اپنی توتلی زبان سے دل ہلا دینے والے فقرے تخلیق کرتا۔اور ماں باپ کو احساس کراتا۔کہ تم دونوں زندہ ہو۔مجھ سے ٹوٹ کر پیار کرتے ہو۔پھر بھی روزانہ چھ سات گھنٹے کی یتیمی میرے لئے مقدر ہو گئی ہے کہ میں سہما سہما در و دیوار کو دیکھتا ہوں۔اور ہمسائیوں کے ان بچوں کو بھی جنہیں ان کی مائیں اپنے گداز سینوں کی حرارت پہنچاتی ہیں۔۔۔۔

غالباً یہ بابر ہی تھا۔جس نے بانو سے ریڈیو کی نوکری چھڑوائی۔چار چھ ماہ بعد دوبارہ پشاور جانا ہوا۔سقراط اور بقراط سے تفصیلی ملاقاتیں ہوئیں۔اور میں نے بانو کا افسانوی مجموعہ مات بنگڑی پڑھا۔تو فوراً ترغیب ہوئی۔کہ اتنے خوبصورت افسانوں سے پاکستان کے دوسرے لوگ کیوں محروم رہیں۔لہذا میں نے ترجمے کی حامی بھری اور بانو کے چھ سات افسانے اپنے ساتھ لے آیا۔سب سے پہلے مات بنگڑی کا ترجمہ"ٹوٹی ہوئی چوڑیاں" کے عنوان سے کیا۔یہ افسانہ حکایت میں شائع ہوا۔اور پھر کئی پرچوں نے اسے دوبارہ چھاپا۔زیر نظر کتاب میں بھی یہ افسانہ"کانچ کے ٹکڑے" کے عنوان سے موجود ہے۔لیکن اس میں وہ تاثر نہیں۔جو میرے ترجمے میں موجود تھا۔خدا جانے۔اس بیانیہ لہجے کے ترجمے کو

میرے افسانوی انداز پر کیوں ترجیح دی گئی؟

بانو کے دوسرے افسانوں کے ترجمے بھی ہوتے رہے۔اور وقتاً فوقتاً پاکستان کے مختلف رسائل میں چھپتے رہے۔یوں بانو پاکستان کے اردو دان طبقہ میں اچھی خاصی متعارف ہوگئیں۔اس سلسلے کا ایک لطیفہ یا حقیقہ بھی سن لیجئے۔۔۔محترمہ عذرا اصغر پرچہ نکالنا چاہتی تھیں۔ان کا خط آیا۔۔۔پرچے کے لئے افسانہ مانگ رہی تھیں میرے پاس اپنا کوئی افسانہ تیار نہ تھا۔بانو کا ایک افسانہ ترجمہ کر کے بھیج دیا۔محترمہ کا جوابی خط آیا۔افسانے کے نفس مضمون کے علاوہ میرے ترجمے کی تعریف کی تھی۔اور یہ کہ 'ترجمہ نہیں' بلکہ بالکل اوریجنل لگتا ہے۔ساتھ ہی تاکید کی تھی۔کہ میں اپنا افسانہ بھی لکھ کر بھیجوں۔

کچھ عرصہ بعد تاج اور بانو'' قند'' کی کسی تقریب کے سلسلے میں لاہور آئے۔جب میں نیشنل سنٹر پہنچا تو عذرا اور بانو ایک کونے میں کھڑی کسی بات پر ہنس رہی تھیں۔مجھے دیکھا۔تو اشارے سے بلایا۔بانو بہت خوش تھی۔ہنستے ہوئے بولی۔۔۔''عذرا کہہ رہی ہے۔میں نے رحیم گل کو بانو کے افسانوں کی وجہ سے جانا ہے!''

بے چاری عذرا کا برا حال تھا۔وہ شاید صفائی پیش کرنا چاہتی تھی۔لیکن اس کے سنبھلنے سے پہلے میں نے کہہ دیا۔۔۔۔۔''اس طرح کی بات عذرا نے لوگوں سے بھی کہی ہے۔کہ رحیم گل کی وجہ سے بانو اردو ادب میں متعارف ہوئی ہیں!''

اب دونوں کا برا حال تھا اور میں ہنس رہا تھا مگر کمال ہے۔تینوں انا کے مارے ہوؤں میں سے کسی نے بھی برا نہ مانا۔اور دوسرے دن صاف ذہن کے ساتھ عذرا اصغر کی دعوت میں شریک ہوئے۔

ایک بات میں کہنا بھول گیا۔۔۔کہ بانو شاعرہ ہے۔اور تاج بھی شاعر ہے۔دونوں ادیب ہیں۔ایک اردو کا،دوسرا پشتو کا،تاج خالص پشاوری ہے اور بانو خالص پٹھان ایک کی مادری زبان پشتو،شادی کو اتنے سال گزر گئے۔مگر جس طرح تاج،بانو کا اردو لہجہ درست نہ کر سکا۔اسی طرح بانو،تاج کا پٹھانی لہجہ درست نہ کر سکی۔۔۔یہ بالکل اس طرح،جیسے خاطر غزنوی،فارغ بخاری اور تاج سعید سرحدی ہونے کے باوجود پشتو بولتے ہیں۔تو صاف معلوم ہوتا ہے۔گویا جھوٹ بول رہے ہوں۔اور خود میں،جسے آپ اردو کا ادیب کہتے ہیں۔جب اردو بولتا ہوں تو احباب کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔اور طنزیہ انداز میں مسکراتے ہیں کہ اچھا تو یہ ہے''تن تارارا'' کا مصنف مگر یہ ہمارے مسائل ہیں۔اگلی نسل کے مسائل نہیں،ان کے بچے فسٹ کلاس پشتو بولتے ہیں۔فسٹ کلاس اردو بولتے

ہیں۔اور ہندکو تو خیر گھر کی لونڈی ہے۔۔۔تو نتیجہ یہ نکلا ۔کہ بین الاضلاعی شادیاں بہت ضروری ہیں۔ ہندکو اور پشتو کا یہ اتصال بے حد نتیجہ خیز نکلا ہے۔لیکن ایک بات محسوس ہوتی ہے۔کہ چونکہ ہندکو کا لہجہ دھیما اور میٹھا ہے۔پشتو نسبتاً کھردری اور اکھڑ زبان ہے۔۔۔۔غالباً یہی وجہ ہے۔کہ زبانوں کی فطرت اپنا اپنا رنگ دکھاتی ہے۔اور سقراط بقراط کے سامنے سہما سہما سا رہتا ہے۔

جب وہ بانو کی ڈانٹ ہنستے مسکراتے اور چمکتے دانتوں سے سنتا ہے۔تو میں سمجھتا ہوں ۔یہ کوئی بزدلی یا برائی نہیں ہے۔ بلکہ ایک پہلو سے یہ ضروری ہے کہ گھر میں عورت کی کمانڈ ہو۔اس طرح ننانوے فیصد فساد خود بخود ختم ہوجاتا ہے۔

بے چاری بانو ایم اے کرنے کے باوجود چار پانچ بچوں کی ماں کا مقدس درجہ رکھتی ہے۔ملازمت کرتی ہے۔گھر کو صاف ستھرا رکھتی ہے۔سارے گھر کو ناشتہ اور دووقت کی روٹی پکا کر دیتی ہے۔اور اس پر طرّہ یہ کہ افسانے بھی لکھتی ہے۔یعنی دوطرح کی تخلیق ،خوبصورت افسانوں اور خوبصورت بچوں کی تخلیق ،۔۔۔۔مگر اس کے بدلے مانگتی کیا ہے۔گھر کی چابیاں،اور قدرے بلند آہنگی کا مظاہرہ۔

تو کیا حرج ہے اس میں۔۔۔۔میں اصغر مہدی صاحب اور سقراط سے کہوں گا۔کہ اگر خوش قسمتی سے آپ کی بیویاں افسانہ نگار ہیں۔اور روپے کے ساتھ نام بھی کماتی ہیں۔گھر کا نظام بھی چلاتی ہیں۔تو آپ سے زیادہ خوش قسمت اور کون ہوگا۔۔۔۔ایک ہماری بیوی ہے کہ لکھنے کا موڈ بنتا ہے تو کروٹ بدل کر کہتی ہے۔۔۔۔

''اب تو سو جائیں۔اب تو بتی بجھادیں آپ!''

میرا خیال ہے آپ دونوں ایسے گئے گزرے نہیں کہ تخلیقی لمحوں کے کرب کا احساس نہ کریں اور بیویوں سے کہیں۔۔۔''جان من اب تو سو جائیں اب تو بتی بجھادیں آپ!''

محترم اصغر مہدی کا ذکر آ گیا ہے۔جی چاہتا ہے آج کی محفل میں اصغر مہدی کو بھی سقراط کا خطاب دے دوں۔لیکن ادھر عذرا کو بقراط کہنے سے ڈر بھی لگتا ہے!

اب بیویوں کا ذکر آ گیا ہے۔تو لگے ہاتھوں اپنی بیوی کا قصہ بھی سن لیجئے۔چودہ پندرہ برس پہلے شادی ہوئی۔اپنی نئی نویلی دلہن سے کہا۔

''چل مُیارے،تینوں اپنے دیس دے چپلی کباب کھلا واں!''بولی۔۔۔۔''نابابانا،مجھے پٹھانوں سے ڈر لگتا ہے اور چپلی کباب تو ہرگز نہیں کھاؤں گی!''

اگر محبت کا چکر نہ ہوتا۔ کیونکہ ناکام محبتوں کے بعد یہ دسویں کامیاب محبت تھی۔ تو ایسا جواب سن کر آپے سے باہر ہونا بہت ضروری تھا۔ مگر یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ ایک دن آئے گا تجھے کبابوں کے ذائقے کی ایسی ماردوں گا۔ کہ تڑپ تڑپ کر کہو گی۔۔۔"ایک بار کھایا ہے۔ دوسری بار کھانے کی ہوس ہے!

اور وہی ہوا۔۔۔ایک بار دھوکے سے گرم گرم چپل کباب کھلائے تو کوہ ندا سے فوراً آواز آئی ۔۔۔"ایک بار دیکھا ہے۔ دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے!"

مگر میں بھی پٹھان۔ دس برس تڑپائے رکھا۔ جب بالکل ہار گئی تو اس پر ترس آ گیا۔ آخر وہ میرے بچوں کی ماں تھی۔ چنانچہ ستراط کو خط لکھا کہ ہم پشاور آ رہے ہیں۔ میری بیوی جلیل کی دکان کے کباب کھانا چاہتی ہے۔ ستراط نے کہا۔

بسر و چشم، بہ دل و جان، چشم ما روشن دل ما شاد،

بانو سے میری بیوی کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ دونوں گلے ملیں دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا۔

جب وہ دونوں میاں بیوی ہماری خاطر و مدارات کا بجٹ تیار کرنے دوسرے کمرے میں گئے۔۔۔تو میری بیوی کی رگِ تنقید پھڑک اٹھی۔ جیسے کہ عورتوں کی عادت ہوتی ہے۔۔ بولی۔۔"ویسے تو بانو اچھی ہے۔ مگر بالوں کا سٹائل اچھا نہیں!"

میں نے کہا۔۔۔"ممکن ہے۔ بانو کو تمہارے بالوں کا سٹائل پسند نہ ہو۔؟

بولی۔۔۔"آپ کو کونسا سٹائل پسند ہے۔۔۔؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔۔۔"مجھے تو تمہارے سادہ بال اچھے لگتے ہیں"

اتنے میں بانو آ گئی۔ بولی۔۔"گل صاحب، ویسے تو آپ کی بیوی اچھی ہے۔ آپ کے لائق ہے مگر ایک بات بتاؤں۔ آپ دونوں بہن بھائی لگتے ہیں!"

شام کو بانو سکول سے واپس آئی۔ تو بہت خوش تھی۔ کہنے لگی۔۔۔"آج میں نے دوسری ٹیچرز کے سامنے بہت ڈینگیں ماری ہیں کہ "تن تارارا" کا مصنف ہمارا مہمان ہے سب آپ سے ملنے کی خواہش مند تھیں۔ لیکن جب میں نے انہیں بتایا۔ کہ بیوی بچوں سمیت آیا ہے۔ تو معاملہ بگڑ گیا۔

اور پھر وہ بے ساختہ قہقہے مارنے لگی۔

شام کے کھانے میں بھی بانو نے بہت اہتمام کیا تھا۔ لیکن مرغ بوڑھا تھا۔ اور شدید زور آزمائی کے

باوجود ہماری دال نہ گل سکی۔ لیکن بھلا ہو ستراط کا۔ وہ ڈیڑھ دو سیر چپل کباب جلیل کی دکان سے اٹھالایا تھا اور ہم ندیدوں کی طرح اس پر پل پڑے تھے۔ اور پھر ایسے سوئے کہ آنکھ کھلی۔ تو لاہور میں تھے۔
(رحیم گل کی کتاب۔ پورٹریٹ سے)

ایوب صابر

پشتو ادب کی خاتون اول

ادب میں کئی جوڑیاں مشہور ہیں۔ ایک جوڑی اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کی ہے، دوسری کشور ناہید اور یوسف کامران کی ہے اور تیسری تاج سعید اور زیتون بانو کی ہے۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ پہلی اور تیسری جوڑی میں شوہروں کے نام پہلے آتے ہیں۔ اور درمیانی جوڑی میں بیوی کا نام پہلے آتا ہے۔ اس کی وجہ پچھلے دنوں فارغ بخاری نے پشاور کلب میں بتا دی تھی۔ جہاں کشور ناہید کے اعزاز میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ جو لوگ اس محفل میں شریک نہ تھے۔ ان کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ اور لوگوں کی اولاد سعادت مند ہوتی ہے۔ کشور ناہید کے شوہر سعادت مند ہیں اور جب شوہر سعادت مندی شعار کرتا ہے، تو بیوی شوہر بن جاتی ہے اور شوہر بے چارہ بیوی بن کر باورچی خانہ میں برتن مانجھنے لگتا ہے۔ میں کشور ناہید کے گھر کا بھیدی نہیں ہوں۔ اس لئے یہ لنگا ڈھا نہیں سکتا کہ یوسف کامران نے کشور ناہید سے شادی کے بعد باورچی خانہ سنبھال لیا ہے لیکن ایک بات سب کو معلوم ہے وہ یہ کہ اگر یوسف کامران خود باورچی خانے میں نہیں پایا جاتا، تو کشور ناہید پر بھی اس نے باورچی خانے کے اندر رہنے کی پابندی نہیں لگائی۔ وہ زمانہ گیا جب عورت باورچی خانے کے اندر ہانڈی میں چمچہ پھیرتی تھی۔ اور باورچی خانے سے باہر صرف بہشتی زیور پڑھتی تھی۔ آج کی عورت ہانڈی بھی پکاتی ہے اور افسانے بھی لکھتی ہے۔ زیتون بانو کو ہی لے لیجئے۔ جس نے ہانڈیاں کم پکائی ہیں اور افسانے زیادہ لکھے ہیں اور صرف افسانوں پر موقوف نہیں ہے۔ اس نے نرم و نازک اشعار بھی کہے ہیں، ڈرامے بھی لکھے ہیں صداکاری اور اداکاری کے جوہر بھی دکھائے ہیں۔ ملازمتیں بھی کی ہیں اور آج تک کسی ملازمت میں اس نے تین سے زیادہ ترقیاں اس لئے حاصل نہیں کیں کہ جب مرد یہ دیکھتے ہیں کہ عورت ان پر سبقت لے جارہی ہے تو وہ اس کے خلاف محاذ بنانے لگتے ہیں اور اس محاذ آرائی اور اس کمینگی سے تنگ آکر وہ ملازمت چھوڑ دیتی ہے۔ زیتون بانو نے اب تک تین ملازمتیں چھوڑی ہیں۔ حال ہی میں چوتھی ملازمت میں بھی اسے تیسری ترقی ملی ہے اور اس ترقی کو وہ خطرے کی گھنٹی سمجھتی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ یہ تیسری

گھنٹی بھی بج ہی جائے تو اچھا ہے۔ کیونکہ یہ چوتھی ملازمت بھی زیتون بانو کے شایانِ شان نہیں وہ سکول میں نا بالغ بچوں اور بچیوں کو پڑھاتی ہے۔ جب کہ وہ اس اہل ہے کہ کسی کالج میں بچوں اور بچیوں کو پڑھائے اور ان کی تہذیب یوں کرے جیسے ایک چرواہا بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی تہذیب کرتا ہے۔

زیتون بانو نے سکول سے کالج تک پہنچنے کی کوشش کئی بار کی ہے اور اب تک لیکچرار اس لئے نہیں بن سکی کہ اس نے پشتو میں ایم۔اے سیکنڈ ڈویژن میں کیا ہے۔ ویسے جب وہ ایم۔اے کا امتحان دے رہی تھی تو پشتو کے ایک شاعر نے پیشین گوئی کر دی تھی کہ تم گولڈ میڈل یا فسٹ ڈویژن نہیں حاصل کر سکوگی! زیتون بانو نے حیران ہو کر پوچھا تھا۔۔۔ کیوں؟ تو شاعر نے جواب دیا تھا کہ یہ اعزاز عموماً وہ طلباء حاصل کرتے ہیں۔ جو گھوٹے لگاتے ہیں اور نصابی کتب گھول کر پینے کے ماہر ہوتے ہیں۔ ایسے طلباء امتحانات میں سوالوں کے جواب مروجہ قواعد کے مطابق دیتے ہیں۔ اور نصابی کتابیں تیار کرنے والے ماہرین تعلیم سے کہیں اختلاف نہیں کرتے۔ تم شاعرہ ہو۔ افسانہ نگار ہو۔ تمہارا اپنا بھی ایک نقطۂ نظر ہے۔ ظاہر ہے تم اپنا نقطۂ نظر پیش کروگی۔ جو پرچے دیکھنے والوں کو پسند نہ آئے گا اور وہ تم کو کم سے کم نمبر دیں گے۔ خیر زیتون بانو نے کم سے کم نمبر تو حاصل نہ کئے، لیکن فسٹ ڈویژن یا گولڈ میڈل بھی حاصل نہ کر سکی۔ یہی وجہ ہے کہ مقابلے کے جن امتحانات میں وہ شامل ہوئی ہے، ان میں لیکچرار وہ لوگ منتخب ہوتے رہے ہیں۔ جن کو وہ پڑھا سکتی ہے۔ یہاں میں ایک اور سوال اٹھاتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ زیتون بانو کی سطح کا کوئی شاعر یا ادیب ایم۔اے نہ بھی ہو۔ تو وہ ایم۔اے کے طلباء کو ان اساتذہ سے اچھا پڑھا سکتی ہے۔ جو گھوٹے لگا کر گولڈ میڈل تو حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن اپنی استعداد نہیں بڑھا پاتے۔ مگر یہ میں کس سے پوچھوں کہ جب لیکچرار منتخب کئے جاتے ہیں تو صرف ان کے ڈویژن کیوں دیکھے جاتے ہیں۔ اور ڈویژن سے ہٹ کر ان کی علمی استعداد کا جائزہ کیوں نہیں لیا جاتا۔ یہ ایک ایسا سوال ہے۔ جس کا جواب اوّل تو کوئی دے گا نہیں۔ اور دے گا، تو مجھے مطمئن نہیں کر پائے گا۔ لہٰذا اس غیر پارلیمانی نقطۂ استحقاق کو یہیں پر چھوڑ دیجئے اور میرے ساتھ آگے بڑھیئے۔ تاکہ میں آپ کو بتا سکوں کہ زیتون بانو کے کتنے چہرے ہیں، کتنے رنگ ہیں، کتنی جہتیں ہیں اور وہ اتنی ممتاز کیوں ہیں کہ اب تک پشتو کے جتنے افسانے اردو میں منتقل ہوئے ہیں۔ ان سے آدھے سے زیادہ افسانے اسی کے ہیں صحیح تعداد تو شاید میں نہ بتا سکوں۔ البتہ میرا اندازہ ہے کہ زیتون بانو نے اب تک پچاس سے زیادہ افسانے لکھے ہوں گے اور ان پچاس سے زیادہ افسانوں میں سے کم از کم پچیس سے زیادہ افسانوں کے تراجم اردو میں ضرور ہوئے ہوں گے۔ اس کے افسانوں کے تراجم کا ایک مجموعہ پچھلے دنوں ''شیشم کا پتہ'' کے نام سے چھپا تھا۔ جس کی دھوم سارے پاکستان میں مچ گئی تھی۔ پھر اردو کے کئی نقادوں اور تبصرہ نگاروں نے ان افسانوں کو نقد و نظر کے ترازو میں تولا اور زیتون بانو میں اتنی خود اعتمادی پیدا کر دی کہ اب اس کے افسانوں کا دوسرا

مجموعہ بھی ''وقت کی دہلیز پر'' کے نام سے اردو میں چھپ رہا ہے۔ ''شیشم کا پتہ'' کے افسانے اس سے پہلے افسانوی مجموعے ''هنداره'' (آئینہ) اور کچھ ''مات بکری'' (ٹوٹی ہوئی چوڑیاں) سے لئے گئے ہیں جبکہ ''وقت کی دہلیز'' اس کے تازہ افسانوں کا مجموعہ ہوگا۔ افسانوں کے علاوہ زیتون بانو نے ریڈیو اور ٹیلی وژن کے لئے ڈرامے بھی لکھے۔ جن میں سے ''سمسور گلونہ'' (کھلے پھول) ایک نل لنتھ پلے تھا۔ جو ریڈیو سے نشر ہوا۔ اس کے علاوہ ریڈیو کی ملازمت کے دوران میں اس نے جو فیچر لکھے، وہ تو بے حد و بے حساب ہیں۔ یہاں یہ بھی بتا تا چلوں تو نامناسب نہ ہوگا کہ زیتون بانو ریڈیو پشاور میں پروڈیوسر بھی رہی ہیں اور اس میدان میں بھی اس نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔

زیتون بانو کے افسانوں کا مجموعہ ''هنداره'' عبدالخالق خلیق مرحوم نے اس وقت چھاپا تھا۔ جب زیتون بانو دسویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ ''هنداره'' کا دیباچہ بھی خلیق صاحب نے ہی لکھا تھا۔ زیتون بانو کے والد پیر سلطان محمود مرحوم اگر چہ خود بھی ایک لکھاری تھے مگر انہوں نے زیتون بانو کو لکھنے کی کھلی آزادی نہیں دی تھی۔ چنانچہ ابتداء میں وہ ثریا بخاری شہناز خلیلہ، رضیہ خانم اور شگفتہ کے فرضی ناموں سے لکھتی رہیں۔ پھر جب اس کے افسانوں کا مجموعہ ''هنداره'' چھپ گیا۔ تو اس نے ڈرتے ڈرتے اپنے والد سے کہا کہ داجی! خلیق صاحب سے میری کتاب کا معاوضہ لے آئیے۔ تو اس کے والد نے ''ایں گل دیگر شگفتہ'' کہہ کر اس امر پر حیرت کا اظہار کیا کہ بانو! میں تو تمہیں ڈاکٹر بنانا چاہتا تھا۔ تم افسانہ نگار کیوں بن گئیں؟ زیتون بانو اس سوال کا کیا جواب دیتی۔ اس کو تو خود بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ ڈاکٹر کی بجائے افسانہ نگار کیوں بن گئی۔ بہر حال اس کے والد بادل نخواستہ خلیق صاحب کے پاس گئے۔ رائلٹی کے سٹامپ پر دستخط کئے اور معاوضہ لئے بغیر ہی گھر لوٹ آئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک بچی آئی اور زیتون بانو کے ہاتھ پر ڈھائی سو روپے رکھ کر چلی گئی۔ انہی دنوں ریڈیو سے خلیق صاحب کا ایک انٹرویو نشر ہوا۔ اور انٹرویو میں جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ کو پشتو کے کون کون سے افسانہ نگار پسند ہیں تو انہوں نے بتایا۔۔۔ قلندر مومند اور زیتون بانو یہ انٹرویو جب خود زیتون بانو نے سنا، تو اس کا دماغ اور خراب ہو گیا اور وہ دیگر ہر چیز کو چھوڑ کر افسانوں کے پیچھے ایسی لٹھ لے کر پڑی کہ اب افسانے مویشیوں کے ایک ریوڑ کی طرح اس کے آگے ہوتے ہیں اور وہ چرواہے کی طرح اس کے پیچھے ہوتی ہے اور یہ چرواہا ایسا ہے کہ اپنے ریوڑ کی کسی بھیڑ یا بکری کو بھٹکنے نہیں دیتا۔ اس ریوڑ کے تمام جانور دودھ دیتے ہیں اور ملک کے دیگر علاقوں کے چرواہے اس دودھ کو اردو کی بوتلوں میں بند کر کے بیچتے ہیں۔

زیتون بانو کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ ''ژوندی غمونہ'' (سانس لیتے ہوئے غم) زیر طباعت ہے۔ اس کا پہلا شعری مجموعہ ''سوغات'' بھی ترتیب کے مراحل سے گذر گیا ہے۔ زیتون بانو کے پبلشر تاج سعید خود ہی ہیں اس خوش بختی پر زیتون بانو کو ناز کرنا چاہئے کیوں کہ وہ ایک شاعرہ اور ادیبہ ہے اور اسے معلوم

ہے کہ کتاب چھپوانے کے لئے کتنی اذیتوں سے گذرنا پڑتا ہے اور اکثر اوقات کتاب کے مصنف کو کتاب کا معاوضہ یا رائلٹی نہیں ملتی۔ یہ ایک اتفاقی امر ہے کہ عبدالخالق خلیق مرحوم نے زیتون بانو کو اس کے پہلے افسانوی مجموعے کا معاوضہ دے دیا تھا۔ جب کہ پاکستان میں مصنفین بے شمار ہیں، جن کو نہ پہلی کتاب کا معاوضہ ملتا ہے نہ آخری کتاب کا۔

زیتون بانو کو میں نے سوچ سمجھ کر خوش بخت خاتون قرار دیا ہے اور اس کی خوش بختی کی سب سے بڑی علامت تاج سعید ہیں۔ اگر زیتون بانو کی شادی تاج سعید کی بجائے "سپینہ وڑی" کے کسی خان سے ہو جاتی تو وہ اب تک بچے پیدا کرنے والی ایک مشین ہی ہوتی۔ ویسے دنیا کی آبادی میں چار خوبصورت بچوں کا اضافہ اس نے تاج سعید کے ساتھ شادی کے بعد بھی کیا ہے۔ لیکن یہاں اس نے پچاس سے زیادہ افسانے اور اتنی ہی غزلیں بھی تخلیق کی ہیں۔ اگر اس کے پلے کوئی روایتی قسم کا شوہر پڑتا۔ تو اس کے بچوں کی تعداد پچاس اور افسانوں کی تعداد چار ہوتی۔ تاج سعید کے ساتھ شادی کر کے زیتون بانو زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرنے اور کم سے کم افسانے لکھنے کے عذاب سے بال بال بچ گئی ہے وہ بلاشک وشبہ ایک خوش بخت خاتون ہے۔

زیتون بانو ایک پشتون عورت ہے۔ پشتون عورتوں میں شرم و حیا کا عنصر دیگر قبیلوں کی عورتوں سے کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ زیتون بانو جب لڑکی تھی تو اسے گھر سے صرف کالج جانے کی اجازت تھی۔ ایف۔ ایس۔ سی کے سال اوّل میں اسے دل کا دورہ پڑا اور ڈاکٹروں نے اس کے لئے اور نسخوں کے علاوہ پڑھائی کو ختم کرنے کا نسخہ بھی تجویز کیا۔ اور وہ دیگر پشتون لڑکیوں کی طرح گھر کی چار دیواری کے اندر محصور ہو کر رہ گئی۔ یہاں اس نے شعر کہہ کر اور افسانے لکھ کر تنہائی کی اذیت کو کم کرنا چاہا، تو والد اسے یہ لیکچر پلانے لگے کہ پاکستان میں سب سے زیادہ بے کار اور نکما طبقہ لکھنے والوں کا طبقہ ہے۔ عموماً روٹی ان لوگوں کے آگے ہوتی ہے۔ اور یہ اس کے پیچھے ہوتے ہیں۔ زیتون بانو نے کہا۔۔۔ لیکن داجی! میں ادب کو ذریعہ معاش بنانے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ اس کے والد بولے شاعری، افسانہ، ڈرامہ دماغی عیاشی کے مختلف نام ہیں۔ گھر میں بیٹھ کر نصابی کتب پڑھو۔ پرائیویٹ امتحانات دو۔ سلائی اور کشیدہ کاری میں مہارت پیدا کرو۔ اچھے کھانے پکانا سیکھو۔ خود بھی کھاؤ ہمیں بھی کھلاؤ۔ غزلوں اور افسانوں اور ڈراموں سے انسان کا پیٹ نہیں بھرتا۔ یہ سب بیکار چیزیں ہیں۔ پرائیویٹ امتحانات بھی دیئے اور ادب بھی تخلیق کیا۔ کیونکہ اس کا یہ عقیدہ ہے کہ ادب ہر سلیم الطبع آدمی کی ذہنی خوراک ہے۔ اور خوراک کے بغیر انسان کی روح بھوکی اور پیاسی رہتی ہے۔

زیتون بانو نے کالج ایف۔ ایس۔ سی کے سال اوّل میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ گھر میں اس نے پہلے ایف اے اور پھر بی ایڈ کے امتحانات پاس کئے اور ایک مڈل سکول میں ہیڈ مسٹریس ہو گئی۔ تاج سعید سے شادی کے بعد اس نے معلّمی کا پیشہ چھوڑا اور ریڈیو میں آ گئی۔ ریڈیو کی پروڈیوسری کے زمانے میں زیتون

باتو نے میرا ایک ڈرامہ ''زخمونہ'' یہ کہہ کر رد کر دیا تھا کہ اس موضوع پر اس سے پہلے بھی دو ڈرامے نشر ہو چکے ہیں۔ ایک محمد افضل رضا اور دوسرا سیدہ ناز جاوید کا۔ میں بضد تھا کہ ایک موضوع پر دو ڈرامے نشر ہو سکتے ہیں، تو تیسرا کیوں نشر نہیں ہو سکتا۔ زیتون باتو کا استدلال یہ تھا کہ اس موضوع پر دوسرا ڈرامہ میں نے پیش نہیں کیا تھا اور تیسرا بھی میں پیش نہیں کروں گی۔ ریڈیو ملازمت کے دوران میں اس قسم کی اصول پرستیاں زیتون باتو اکثر کیا کرتی تھی۔ چنانچہ یہاں اس کے مخالفین کا ایک خاصا بڑا حلقہ پیدا ہو گیا۔ اور اسے ریڈیو کی ملازمت کو خیر باد کہنا پڑا۔ آج میں اعتراف کرتا ہوں کہ زیتون باتو نے میرے ایک ڈرامے کو رد کر کے اچھی مثال قائم کی تھی۔ اور میں اس کی اصول پرستی کا قائل ہو گیا تھا۔ اب اپنے ڈرامے کی طرف آتا ہوں اور یہ حلف اٹھاتا ہوں کہ محمد افضل رضا اور سیدہ ناز جاوید کے ڈرامے نہ میں نے اس وقت سنے یا پڑھے تھے۔ نہ اس کے بعد اب تک پڑھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے ڈرامے کو میں اب بھی (Origional) اوریجنل ڈرامہ سمجھتا ہوں۔ یہ ڈرامہ بعد میں پہلے ریڈیو سے نشر ہوا، اس کے بعد ''قند'' میں چھپ بھی گیا۔ میں اس ڈرامے کو اب بھی اپنی جائز اولاد سمجھتا ہوں۔ اور اس کو میں نے محفوظ کر رکھا ہے تا کہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔ زیتون باتو ابتداء میں برقعہ پہنتی تھی۔ برقعہ نے ریڈیو کی ملازمت تک اس کا پیچھا کیا۔ وہ گھر سے برقعہ میں نکلتی اور ریڈیو کی چار دیواری کے اندر برقعہ اتار کر اوور آل پہن لیتی۔ تاج سعید اسے مسلسل اکساتا رہا کہ برقعہ کو ہمیشہ کے لئے اتار دو۔ مگر پشتون عورتوں کی روائتی حیاء مانع رہی اور وہ برقعہ سے شادی کے بعد بھی ایک عرصہ تک جان نہ چھڑا سکی۔ تاج سعید بھی ہٹ کا پکا تھا۔ وہ اسے مسلسل سمجھاتا رہا کہ شرم اور حیاء اور شرافت اور پاکیزگی اندر کی چیزیں ہیں۔ ان کا برقعہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تاج سعید نے قبائلی خواتین کو مثال بنا کر کہا کہ ان سے زیادہ حیاء کس میں ہو گی۔ مگر وہ سب دور دور سے پانی بھر کر لاتی ہیں۔ کھیتوں میں کام کرتی ہیں، گیہوں پیستی ہیں۔ آٹا نکالتی ہیں۔ اس کو گوندھ کر روٹی پکاتی ہیں، کھاتی ہیں، کھلاتی ہیں اور ضرورت پڑے تو میدانِ جنگ میں بھی کود پڑتی ہیں، گولیاں چلاتی ہیں۔ مرہم پٹی کرتی ہیں۔ زندگی کے ہر میدان میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں۔ اپنے آپ کو مردوں سے کم نہیں سمجھتیں۔ تاج سعید کی باتیں زیتون باتو پہلے ایک کان سے سنتی اور دوسرے سے نکال دیتی۔ پھر ان باتوں نے اس کے دل میں گھر کرنا شروع کر دیا۔ اور آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہ اس محفل میں موجود ہے اپنے بارے میں مضامین سن رہی ہے۔ اور ہر مضمون کا مناسب جواب سوچ رہی ہے۔ اس کے وجود پر برقعہ نہیں۔ اوور آل نہیں۔ اور اس کے چہرے سے وہ پاکیزگی جھلک رہی ہے۔ جو اندر کی چیز ہے۔

زیتون کے دادا پیر عبد القدوس شاعر تھے اور ''تندر'' (برق) تخلص کرتے تھے۔ اس کے والد پیر سلطان محمود نے شعر کم کہے اور نثر زیادہ لکھی۔ زیتون باتو اپنے والد کی شاعری سے قطعی متاثر نہیں۔ البتہ

ان کی نثر سے متاثر ہے۔ تاہم ایک بات طے ہے کہ شاعری اس کو ورثہ میں ملی ہے۔ اور اس خاندانی وراثت کو اس نے بڑے خلوص اور بڑی دیانت داری سے برتا ہے۔

1965ء کی پاک و ہند جنگ کے دوران میں پاکستانی شاعروں نے ہزاروں ترانے لکھے تھے۔ جب کہ ہندوستانی شاعروں کے بارے میں یہ کہہ کہ حیرت کا اظہار کیا گیا تھا کہ صرف سترہ دنوں کے اندر اتنے ترانے کیسے لکھے جا سکتے ہیں۔ بلکہ انہوں نے اس شک کا اظہار بھی کیا تھا کہ ممکن ہے کہ پاکستانی شاعروں نے یہ ترانے پہلے ہی سے لکھ رکھے ہوں۔ فیض احمد فیض اور قلندر مومند کی طرح زیتون بانو کو بھی 1965ء کی جنگ (Inspire) نہیں کر سکتی تھی۔ پھر جب تاج سعید نے جنگ کے بعد اسے یہ طعنہ دیا کہ تم کیسی شاعرہ ہو کہ ملک کے مختلف حصّوں پر پورے سترہ دنوں تک بمباری ہوتی رہی۔ وطن کے جیالے مختلف محاذوں پر شہید ہوتے رہے اور تم نے اس جنگ پر ایک شعر بھی نہ لکھا۔ اگر زیتون بانو چاہتی، تو تاج سعید کو یہ کہہ کر مطمئن کر سکتی تھی کہ شعر زبردستی نہیں لکھے جاتے۔ بلکہ یہ خود بخود ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور یہ کہہ کر تاج سعید کا منہ بند کر دیا کہ۔

دَ عزت پګړۍ زوانانو ته په سر شو
دَ بانو په برخه ټشه لوپټه ده

(عزت کی پگڑیاں جوانوں کے سر پہ رکھ دی گئی ہیں۔ بانو کے حصّے میں صرف دوپٹہ آیا)

اس شعر سے یہ تاثر ابھرتا ہے جیسے زیتون بانو اپنی جنس سے مطمئن نہ ہو۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر سرحد کی اس جوڑی کی جنس تبدیل ہو جائے۔ یعنی زیتون بانو تاج سعید بن کر سکوٹر چلانے لگے۔ اور تاج سعید زیتون بانو بن کر سکوٹر کے پیچھے بیٹھنے لگے اور ہانڈی پکانے لگے اور اپنی زچگی کی اذیت سے دوچار ہونا پڑے اور ایسے میں پاکستان کو اپنے دفاع کی جنگ لڑنی پڑے۔ اور ہزاروں ماؤں کی گود اُجڑ جائے۔ تو تاج سعید کا روّیہ کیا ہوگا وہ جنگی نظمیں لکھے گا، یا اُجڑی ہوئی گودوں کا ماتم کرے گا؟

زیتون بانو کو ابتداء میں اس کے والد لکھنے سے روکتے رہے۔ پھر جب انہوں نے دیکھا کہ بیٹی باپ دادا سے آگے بڑھ رہی ہے۔ تو وہ راستے سے ہٹ گئے۔ اب زیتون بانو کی راہ میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں تھی۔ چنانچہ اس نے ایک فاتح کا روپ دھار لیا۔

وہ آئی
اس نے لکھا
اور وہ چھا گئی

اس نے یکے بعد دیگرے کئی ادبی فتوحات حاصل کیں۔ کئی مورچے فتح کیے۔ شاعری کا مورچہ، افسانے کا مورچہ، ریڈیائی فیچروں کا مورچہ، طنز کا مورچہ، تنقید و تحقیق کا مورچہ، غرض یہ کہ اس نے پشتو

ادب کے ہر پھٹے میں ٹانگ اڑائی اور اس کی ٹانگ کہیں بھی زخمی نہ ہوئی۔ وہ ہر مورچے سے سرخرو ہو کر گذری۔ آج پشتو ادب میں شاعری میں تو فوزیہ انجم اس کے شانے سے شانہ ملا کر چل رہی ہے۔ لیکن نثر میں اس کی ہم پلہ خاتون کوئی نہیں ہے۔

زیتون بانو اور فوزیہ انجم سے پہلے پشتو شاعری میں الف جان خٹکہ اور سیدہ بشریٰ بیگم کا طوطی بولتا تھا۔ اور یہ دونوں قوم پرست شاعرات تھیں۔ یہ دونوں زندہ ہیں اور ادب سے س۔ب۔ب کا تعلق اب بھی قائم ہے۔ البتہ الف جان خٹکہ کا سراغ نہیں ملتا۔ کیوں نہیں ملتا یہ ایک الگ داستان ہے۔ جس کو یہاں چھیڑنا مناسب نہیں۔ میں تو یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ سوائے فوزیہ انجم کے پشتو کی دیگر تمام لکھنے والیاں اس ترقی یافتہ دور میں بھی قدامت پسندی سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکیں۔ جب کہ زیتون بانو پشتو کی وہ پہلی شاعرہ ہیں۔ جس نے قدامت پسندی کے بت کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا اور ایک توانا نسوانی آواز بن کر پشتو ادب میں اُبھری تھی۔ یہ آواز پشتو ادب میں آج بھی گونج رہی ہے اور اس کی بازگشت سے پشتو ادب کے گنبد میں جو گونج پیدا ہو رہی ہے۔ اس سے نئے نئے چشمے پھوٹ رہے ہیں اور پشتو ادب کو سیراب کر رہے ہیں۔

زیتون بانو خود بھی پشتو لکھتی ہے اور دیگر پشتون خواتین کو بھی لکھنے پر اکساتی رہتی ہے۔ جب وہ ریڈیو میں تھی تو اس کی ایک ساتھی زاہدہ حلیم خطوط اردو میں لکھتی تھی حالانکہ اس کی مادری زبان پشتو تھی۔ پھر جب زیتون بانو نے ایک روز اسے طعنہ دیا کہ پشتون عورت ہو کر اردو میں خطوط لکھتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی؟ تو اس نے نہ صرف خطوط بلکہ پشتو ڈرامے لکھنے بھی شروع کر دیئے۔

ریڈیو کے پروگراموں میں ذکیہ حلیم بھی حصہ لیا کرتی تھیں۔ زیتون بانو نے اسے بھی پشتو لکھنے کے انجکشن دیئے اور وہ بھی ریڈیو کے لئے ڈرامے لکھنے لگی۔ اس کا ایک ڈرامہ میں سن کر چونک پڑا۔ ریڈیو پشاور سے جو پشتو کے ڈرامے نشر ہوتے ہیں ان میں سے ننانوے فی صد ڈرامے نہایت کمزور ہوتے ہیں۔ ان میں کہانی تو سرے سے ہوتی نہیں۔ پلاٹ بدمزہ، مکالمے پھیکے جیسے چند کردار کسی چنڈوخانے میں محو گفتگو ہوں اور مختلف آوازوں کی نقلیں اتار رہے ہوں ذکیہ حلیم کا ڈرامہ ریڈیو کے روایتی ڈراموں سے مختلف تھا اور اس نے مجھے خاصا متاثر کیا تھا۔ اس کے بعد جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ ذکیہ حلیم کو لکھنے کی ترغیب زیتون بانو نے دلائی ہے تو مجھے یہ بھی ماننا پڑا کہ زیتون بانو صرف شاعرہ اور ادیبہ نہیں، شاعر گر اور ادیب گر بھی ہے۔

فوزیہ انجم ایک نئی اور چونکا دینے والی آواز کے ساتھ پشتو ادب میں داخل ہوئی ہے۔ اور اس کی پذیرائی جتنی خود میں نے کی ہے۔ اتنی اور کسی نے نہیں کی لیکن شادی کے بعد جب وہ شاعری سے کٹ گئی اور گھریلو عورت بن گئی، تو اسے ادب میں واپس لانے کا کارنامہ زیتون بانو نے انجام دیا، اور میں سمجھتا

ہوں کہ زیتون بانو نے جہاں پشتو ادب پر دیگر احسانات کئے ہیں، وہاں اس کا ایک احسان یہ بھی ہے کہ اس نے فوزیہ انجم کو مرنے نہیں دیا۔ ورنہ پشتو شاعری ایک آواز، ایک منفرد انداز اور ایک پُر کشش اسلوب سے محروم ہو جاتی۔

زیتون بانو ایک پڑھی لکھی پشتون خاتون ہے۔ اس کا مشاہدہ وسیع اور مطالعہ گہرا ہے۔ پشتو زبان تو خیر اس کے گھر کی کنیز ہے۔ وہ اردو اور انگریزی ادب کا مطالعہ بھی بڑے انہاک سے کرتی ہے۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ صرف ایک زبان کے کوزے میں بند ہو کر کوئی سمندر نہیں بن سکتا۔ جب وہ سکول میں پڑھتی تھی تو علامہ راشد الخیری اور ڈپٹی نذیر احمد کے ناول نہیں پڑھتی تھی۔ سعادت حسن منٹو کے افسانے پڑھتی تھی۔ اور اس کی ہم جماعت لڑکیاں اس پر چوٹ کرتی تھیں کہ تم بے حیا ہو۔ سعادت حسن منٹو کی فحش تحریریں پڑھتی ہو پھر جب ان لڑکیوں نے سکول سے کالج پہنچ کر خود بھی سعادت حسن منٹو کے افسانے پڑھنے شروع کر دیئے اور ایک روز زیتون بانو نے ان کی چوری پکڑ لی، تو انہوں نے شرماتے ہوئے اعتراف کر لیا کہ بانو! جتنی بالغ تم سکول میں تھیں، اتنی اب ہم ہوئی ہیں اور ہمیں اب پتہ چلا ہے کہ سعادت حسن منٹو کے بغیر اردو افسانوں کا ادب نامکمل ہے۔

زیتون بانو اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں میں سے صرف قلندر مومند سے متاثر ہے۔ اور شاعری کے بارے میں اس کی پسند دوسروں سے نرالی ہے۔ وہ کسی ایک شاعر کے سر اپنی پسند کا تاج نہیں رکھتی بلکہ یہ کہہ کر دامن چھڑاتی ہے کہ مجھے ہر اچھا شعر پسند آ جاتا ہے۔ چاہے وہ کسی نے بھی کہا ہو اور زیتون بانو کی اس پسند پر مجھے آموں کے بارے میں غالب کی پسند کا گمان ہوتا ہے کہ آم میٹھے ہوں اور بہت ہوں۔

زیتون بانو کے گھر میں کئی زبانیں اور کئی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ اس کے بچے کبھی اردو بولتے ہیں، کبھی ہندکو اور کبھی پشتو۔ اور اس کی بلیاں جب میاؤں میاؤں کرتی ہیں، تو اردو، ہندکو اور پشتو کی کاٹ ان کی میاؤں میاؤں میں بھی محسوس ہوتی ہے۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ تاج سعید کی مادری زبان ہندکو ہے اور وہ اردو کا شاعر اور ادیب ہے۔ چونکہ بچے سعادت مند ہیں اور وہ ماں اور باپ دونوں کو خوش رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے تین زبانیں بولتے ہیں۔ کبھی کبھی میں ڈرنے لگتا ہوں کہ زیتون بانو کے گھر میں لسانی فساد نہ برپا ہو جائے۔ اس فساد کو روکنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ وہ یہ کہ زیتون بانو اپنے گھر میں ایک ہی لسانی یونٹ بنا دے اور اپنے بچوں کو پشتو بولنے۔ پشتو پڑھنے اور پشتو لکھنے کی تبلیغ کرے ورنہ تینوں زبانوں کی ٹانگیں توڑتے رہیں گے۔

زیتون بانو کا سب سے چھوٹا بچہ بابر سعید میرا دوست ہے۔ گرمیوں کی کئی دوپہریں اور سردیوں کی کئی طویل راتیں میں نے زیتون بانو کے گھر مہمان بن کر گذاری ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ کھانا کھانے کے بعد جب سب سو جاتے ہیں۔ تو میرا دوست میرے کان میں کہانیاں انڈیلنے لگتا ہے اور مجھ سے بھی کہانیاں

سنانے کی فرمائش کرتا ہے۔ مجھے بچپن کی صرف دو کہانیاں یاد ہیں ایک علی بابا چالیس چور کی اور دوسری گل بکاؤلی کی۔ یہ دونوں کہانیاں میں اپنے دوست کو کئی بار سنا چکا ہوں ایک بار میرا یہ ننھا دوست بولا۔ انکل! صرف دو کہانیوں پر کب تک ٹرخاتے رہو گے۔ کوئی نئی کہانی سناؤ نا۔ چنانچہ اب میں دوسرا نسخہ استعمال کرنے لگا ہوں اب میں لطیفوں اور پہیلیوں کو پھیلا کر کہانیاں بنا دیتا ہوں اور میرا دوست تاڑ جاتا ہے کہ انکل نوسر بازی پر اتر آیا ہے۔ ایک روز اپنے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیلا کر پوچھنے لگا۔ انکل کیا کہانی اور لطیفہ اور پہیلی ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں؟ میں نے کھسیانا ہو کر جواب دیا۔۔۔ نہیں بیٹے! خاندان تو الگ الگ ہیں لیکن تینوں کا آپس میں گہرا یارانہ ہے نا۔ اس لئے ایک ہی خاندان میں رکھنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اب میرے دوست نے مجھے کہانیوں میں لطیفوں اور پہیلیوں کی آمیزش کی اجازت تو دے دی ہے۔ لیکن وہ خالص کہانیوں کا مشتاق ہے۔ اس لئے میری کم سنتا ہے۔ اپنی زیادہ سناتا ہے۔ اور اس کی کہانیاں، کہانیاں ہی ہوتی ہیں لطیفے اور پہیلیاں نہیں ہوتیں۔ آخر زیتون بانو کا بیٹا ہے نا۔

خالص کہانیاں اسے یاد نہ ہوں گی۔ تو کیا مجھے یاد ہوں گی۔ جس کی ماں قرآن حکیم اور دیوانِ رحمن بابا کے علاوہ کوئی کتاب نہیں پڑھ سکتی تھی۔

حجاب امتیاز علی کی بلیوں کا ذکر انتظار حسین نے اپنے کالم، باتیں اور ملاقاتیں میں کیا تھا۔ زیتون بانو نے بھی گھر میں کئی بلیاں پال رکھی ہیں۔ مختلف رنگوں اور مختلف نسلوں کی بلیاں۔ ایک بلی پشتون ہے اور اس کا نام "خانئی" ہے۔ دوسری بلی شاید عربی النسل ہے اور اس کا نام شیبا ہے۔ تیسری بلی انگریز ہے یا شاید امریکی ہو اس کا نام "کٹی" ہے۔ ایک کالا بلا بھی ہے جو اچھوت ہے اور اس کا نام زیتون بانو نے "چوڑ شاہ" رکھا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ چوڑ شاہ اچانک گھر سے غائب ہو گیا۔ اور زیتون بانو کی والدہ نے اس کی گمشدگی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ بلا تمہارے گھر سے احتجاجاً واک آؤٹ کر گیا ہے۔ تم نے اس کے نام کے ساتھ شاہ لگا کر اسے سیّد بنا دیا تھا نا۔ حالانکہ وہ اچھوت تھا۔ آئندہ محتاط رہو۔ اپنے بلوں کو سیّد نہ بناؤ۔ ورنہ تمہارا گھر بلّوں اور بلیوں سے خالی ہو جائے گا اور اس میں صرف کتابیں باقی رہ جائیں گی۔

کتابوں کا معاملہ یہ ہے کہ زیتون بانو کے گھر میں ہر طرف کتابیں بکھری پڑی رہتی ہیں کوئی کمرہ ایسا نہیں جس میں کتابیں نہ ہوں۔ یہاں تک کہ باورچی خانے میں بھی کتابیں موجود ہیں۔ زیتون بانو ان کتابوں کو اپنا رقیب سمجھتی ہے۔ تاج سعید گھر آتا ہے اس کا زیادہ وقت کتابوں کی دیکھ بھال اور ترتیب میں گذرتا ہے۔ بچے سکولوں سے گھر آتے ہیں تو وہ بھی کتابیں گنتے رہتے ہیں۔ ان کی فہرستیں بناتے ہیں۔ ہر کتاب کے آگے اس کی قیمت لکھتے ہیں اور پھر ان قیمتوں کو جمع کر کے ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ اگر ہم لکھ پتی نہیں تو ہزار پتی ضرور ہیں۔ زیتون بانو کا جو بیٹا میرا دوست ہے۔ ایک بار اس نے مجھے بتایا۔ انکل! اس وقت ہمارے گھر میں 35 ہزار روپے کی مالیت کی کتابیں موجود ہیں۔

ایک مفکر نے لائبریریوں کو ''روحوں کا قبرستان'' کہا تھا۔ پشاور میں روحوں کے کئی قبرستان ہیں۔ بعض قبرستان قومی ہیں۔ بعض نجی ہیں۔ نجی قبرستانوں میں سے روحوں کے دو بڑے قبرستان میں نے بھی دیکھے ہیں اور ان کو دیکھ کر دو ہیں مرنے اور دفن ہونے کو جی چاہا ہے۔ ایک قبرستان میں نے خاطر غزنوی کے گھر دیکھا ہے۔ ان کی بیوی بھی کتابوں کو اپنا رقیب سمجھتی ہے یا نہیں۔ البتہ زیتون بانو کو میں نے اپنے گھر کی کتابوں سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کئی بار دیکھا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنا غم و غصہ کم کرنے کے لئے کئی بلیاں پال رکھی ہیں۔ جب تاج سعید گھر آتا ہے اور نئی کتابوں کو الماریوں میں ترتیب دینے لگتا ہے۔ تو زیتون بانو گود میں بلیوں کو بٹھا لیتی ہے اور ان سے انہی کی زبان میں باتیں کرنے لگتی ہے اور اس طرح دونوں ایک دوسرے سے بے نیاز ہو کر بھی وقت اچھا کاٹ لیتے ہیں۔ ورنہ دونوں کے درمیان تیسری جنگِ عظیم کب کی چھڑ چکی ہوتی۔ اور میں اس مخمصے میں پڑتا جاتا کہ کس کا اتحادی بنوں۔ زیتون بانو جو پشتو بولتی ہے اور پشتو لکھتی ہے یا تاج سعید کا جو ہندکو بولتا اور اردو لکھتا ہے۔ تاج سعید سے میرا یارانہ بہت پرانا ہے۔ زیتون بانو کو میں نے تاج سعید سے شادی کے بعد دیکھا، جانا اور پہچانا ہے۔ لیکن ہم دونوں میں ایک قدر مشترک ہے۔ ہم دونوں نے پشتون ماؤں کا دودھ پیا ہے۔ پشتون ماؤں کی گود میں پرورش پائی ہے۔ ہم دونوں کے کانوں میں پشتو کی لوریاں ٹپکائی گئی ہیں۔ لہٰذا میرا رشتہ زیتون بانو سے بہت گہرا ہے۔ اور اگر کبھی ان دونوں کے درمیان جنگ چھڑی، تو مجھے لامحالہ زیتون بانو کا ساتھ دینا پڑے گا۔ بس تاج سعید کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ تصادم سے گریز کرے اور کتابوں سے زیادہ خیال زیتون بانو کا رکھے کتاب کو ہم زیادہ سے زیادہ اولاد کا درجہ دے سکتے ہیں۔ جب کہ زیتون بانو ماں ہے۔ اور ماں۔ اولاد سے بڑی ہوتی ہے۔

ایوب صابر
جناح لائبریری، کوہاٹ

احمد پراچہ

ایک ملاقات ۔ چند باتیں

سوال: افسانہ نگاری کی صلاحیت وراثتاً آپ کو ملی یا خداداد عطیہ ہے؟

جواب: لکھنے کی صلاحیت وراثتاً حاصل ہے لیکن افسانہ نگاری خداداد عطیہ ہے ویسے تو قلندر مومند جو رشتے میں میرے چچا ہیں۔ وہ بھی افسانے لکھتے ہیں اور مجھے پسند ہیں۔ شاید افسانہ لکھنا بھی کوئی خاندانی مرض ہو۔

سوال: محترمہ! آپ نے کن ادیبوں کو شوق سے پڑھا ہے؟

جواب: ہر ادیب کو شوق سے پڑھتی ہوں۔ منٹو! سکول کے زمانے سے پڑھتی چلی آئی ہوں اس کی کوئی تحریر نہیں چھوڑی۔ احمد ندیم قاسمی، موپساں بہت پسند ہیں۔ گل افضل خان بھی اچھے افسانہ نگار ہیں۔ میری نظر میں جو تحریر پڑھنے کے قابل ہو اسے پڑھ لینا چاہیے لکھنے والا چاہے کسی بھی زبان اور نظریئے کا مالک ہو۔"

سوال: آپ کن موضوعات پر افسانے لکھنا زیادہ پسند کرتی ہیں؟

جواب: میرے اردگرد اتنے موضوعات پھیلے ہوئے ہیں کہ کسی خاص موضوع کو چننا میرے لئے ممکن ہی نہیں رہا ہے کیا یہ خوشی کی بات نہیں ہوگی جب میرے لکھے ہوئے ایک جملے سے ہی کسی کا بھلا ہو۔"

سوال: آپ کے خیال میں کیا ادب کے ذریعے معاشرہ کی اصلاح ممکن ہے؟

جواب: اگر ادب۔۔۔ادب ہے۔ تو ہر حرف معاشرہ کی اصلاح کے لئے اٹھتا ہے اس میں ممکن، ناممکن کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

سوال: آپ کے افسانے محض ذہنی تخیل ہوتے ہیں یا ان میں تجربات مشاہدات بھی شامل ہوتے ہیں؟

جواب: میرا ہر افسانہ کسی نہ کسی مشاہدے یا تجربے کا مرہون منت ہوتا ہے اس میں میرے ذہنی تخیل کو کوئی دخل حاصل نہیں ہے۔"

سوال: افسانہ، ڈرامہ، تنقید، غزل، نظم وغیرہ لکھتے وقت آپ کو کسی خاص ماحول کی ضرورت ہوتی

ہے؟"

جواب: کوئی چیز لکھتے وقت میرے اندر کی دنیا میں تلاطم اور میرے باہر کی دنیا میں سکون درکار ہوتا ہے اور بس۔"

سوال: کیا کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ آپ نے خوشبو کے ایک جھونکے کو محسوس کیا اور فوراً افسانہ تخلیق ہو گیا ہو۔"؟

جواب: میرے افسانوں میں آپ کو خوشبو بہت کم محسوس ہو گی کیونکہ میں رستے ناسور قلم کے ذریعے پھوڑتی ہوں اور کچے پکے ناسوروں میں بدبو ہی ہوا کرتی ہے۔"

سوال: جدید نثری نظم، آزاد نظم اور جدید افسانے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔"

جواب: جدید نثری نظم کو میں زیادہ نہیں سمجھ سکتی۔ آزاد نظم بہت خوب ہے دل کے پھپھولے بیان ہو سکتے ہیں قافیہ ردیف کی زنجیروں سے آزاد ہوتی ہے۔ طغیانی کے وقت دریا کا پانی اس وقت تباہی مچا دیتا ہے جب وہ کناروں سے بغاوت کر لیتا ہے لیکن اردگرد کے رہنے والے چوکنے ہو جایا کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے غفلت کی نیند سے جاگنا اور متلاطم رہنا زندگی کے زیادہ قریب عمل ہے۔"

سوال: آپ کو عورت کا کونسا روپ سب سے زیادہ پسند ہے۔؟"

جواب: عورت کا ہر وہ روپ پسند ہے جس میں وہ نیم مرد، نیم عورت کی بجائے مکمل طور پر عورت نظر آئے اور وہ نسائیت کے تقاضوں پر پوری اترتی ہو۔"

سوال: جس طرح عام گھروں میں شوہر اور بیوی کے مابین لڑائی جھگڑا ہو جاتا ہے کیا آپ کے یہاں بھی ایسا ہوتا ہے اور اس صورت میں پہلے کون مناتا ہے؟"

جواب: شکر ہے خدا کا کہ میرے اور تاج کے مابین جھگڑا تو کبھی ہوا نہیں ہاں کبھی کبھار کسی مسئلے پر اختلاف رائے ہو جاتا ہے تو وہ مجھے اپنا نقطۂ نظر سمجھا دیتے ہیں میں اپنے انداز سے نشیب و فراز سمجھا دیتی ہوں اور پھر ایک درمیانی راستہ تلاش کیا جاتا ہے اللہ اللہ خیر صلا۔ اب پہلے کسے کون مناتا ہے یہاں اس کا تو سوال ہی ختم ہو جاتا ہے۔"

سوال: ہمارے سامنے آپ کی چار حیثیتیں ہیں۔

ادیبہ، معلمہ، بیوی اور ماں

آپ کے اندر کی جو فنکارہ ہے وہ آپ کی دوسری حیثیتوں سے متصادم تو نہیں ہوتی ہے؟"

جواب: میرے عورت ہونے کے ناتے بیوی اور ماں کا درجہ میرا حق ہے۔ معلمی میرا پیشہ ہے جس کے ذریعے اکثر دوسروں کی لکھی ہوئی چیزیں طلبہ و طالبات کو سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں۔ ادیبہ ہونے کی حیثیت سے میں اپنے آپ کو قدرے آزاد سمجھتی ہوں کیونکہ اس طرح میں

اپنے تجربات اور مشاہدات دنیا کے سامنے پیش کرسکتی ہوں۔ کتنی خوشی کی بات ہے میری کتاب مات بنگری (ٹوٹی ہوئی چوڑیاں) کو ایم اے پشتو کے نصاب میں شامل کیا گیا اور ایم اے کے طلباء وطالبات کو مجھ جیسے معلمین سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جبکہ آج کل میری دوسری کتاب ڈوندی غمونہ ایم اے کے نصاب میں شامل ہے رہی میرے اندر کی فنکارہ تو وہ میری اور آپ کی بتائی ہوئی چار حیثیتوں سے کیسے متصادم ہوسکتی ہے جبکہ وہ فنکارہ ان ہی حیثیتوں کا ایک لازمی جزو ہے کیا آپ کی نظر میں ایک بیوی۔ایک ماں۔ایک ادیبہ اور ایک معلمہ فنکارہ نہیں ہے؟ تو پھر متصادم ہونے کا کیا جواز ہے؟

سوال: یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض پبلشرز خواتین کے فرضی ناموں سے مرد ادیبوں سے لکھواتے ہیں جس کی وجہ سے دیگر خواتین بھی مشکوک سمجھی جاتی ہیں کیا آپ کے ساتھ بھی ایسا ہوا ہے کہ کسی نے پوچھا ہو کہ یہ افسانہ کس سے لکھوایا ہے؟

جواب: اس نوعیت کا شبہ صرف رشید علی دہقان (مرحوم) کو تھا کہ مجھے غزلیں اور افسانے کوئی دوسرا لکھ کر دیتا ہے۔ایک بار تو وہ مجھ سے پوچھ بھی بیٹھے تھے کہ مجھے کون لکھ کر دیتا ہے؟

میں نے ان سے عرض کیا تھا کہ اگر آپ یہ گناہ اپنے سر لینے کو تیار ہوں کہ یہ سب کچھ آپ مجھے لکھ کر دیتے ہیں تو میں اس کا اعتراف لوگوں کے سامنے بھی کرلوں گی۔''

سوال: آپ دیگر اصناف ادب کے علاوہ ڈرامے بھی لکھتی ہیں یہ بتایئے ایک کامیاب ڈرامے میں آپ کے نزدیک کیا خصوصیات ہونی چاہئیں؟

جواب: کوئی بھی ادب پارہ اگر زندگی کے قریب ہے تو یہی اس کی خصوصیات میں نمایاں خصوصیت ہے ڈرامہ بھی ان خصوصیات کا حامل ہونا چاہیئے میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ فرض کیا کہ ڈرامہ میں شاعر کا کردار ہے تو اسے شاعر جیسی زبان استعمال کرنی چاہیے لیکن اگر ایک عام گھریلو عورت شاعرانہ گفتگو کرے گی تو اس سے ڈرامے کا ستیاناس ہوگا۔''

سوال: کبھی لکھتے وقت ایسا بھی ہوا کہ قلم آپ کے خیالات کا ساتھ نہ دے پایا ہو جو کچھ سوچ میں ہو وہ تحریر میں نہ آرہا ہو دوسرے معنوں میں الفاظ کی کمی یا اظہار کی دقت سے سابقہ پڑا ہو؟''

جواب: زبردستی کی کوئی چیز لکھتے وقت انگلیاں بھی ساتھ چھوڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں آپ قلم کی بات کر رہے ہیں البتہ جب آمد ہو تو خیال خود بخود سنبھلتا ہوا پھیلتا چلا آتا ہے اور اس تخلیق پر میں فخر محسوس کرتی ہوں۔میں قلم چلاتے ہوئے الفاظ کو سنوار کر نہیں لکھ سکتی اس لئے میری لکھائی اس قدر خراب ہوتی ہے کہ اکثر تاج مجھ پر خفا بھی ہوتا ہے لیکن کیا کروں یا خیالات کی خوبصورتی کی

طرف دھیان رکھوں یا تحریر کی خوبصورتی پر توجہ دوں ۔لیکن میرا خیال ہے کہ بڑے لوگوں کی لکھائی اکثر بھدی ہی ہوا کرتی ہے۔خیالات خوبصورت ہوتے ہیں۔ میں اکثر ایسی باتیں کر کے تاج کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتی ہوں اور میری بھدی لکھائی کو تاج اپنے ہاتھ سے صاف کر کے رسائل وغیرہ کو بھجوا دیتے ہیں۔

سوال: محترمہ! اچھا یہ بتائے آپ خواتین کی آزادی کے حق میں ہیں؟''

جواب: آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے۔انسانی حقوق اور اقدار کا حقدار جتنا ایک مرد ہے اتنی ہی ایک عورت بھی ہے اگر عورت غلام ہے تو وہ آزاد نسل کو کیسے جنم دے سکتی ہے؟ اگر آزادی سے آپ کی مراد بے پردگی اور بے راہ روی ہے تو میں اس کے حق میں قطعی نہیں ہوں۔اسلام نے جس آزادی کا حق عورت کو دیا ہے اس کے خلاف میں کیسے ہو سکتی ہوں بلکہ بفضل تعالیٰ میں ایک راسخ العقیدہ مسلمان عورت ہوں۔''

سوال: بعض لوگ نئی نسل سے ناامید ہیں اس سلسلہ میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: نئی نسل کو پرانی نسل نے جنم دیا ہے کیونکہ ہر نئی شاخ پرانے درخت پر اگتی ہے۔ پرانی نسل نے نئی نسل کو جس ڈگر پر ڈالا ہے اب اس کا خمیازہ بھی بھگتے! قصور نئی نسل کا نہیں یہ سب پرانی نسل کی بے توجہی کا نتیجہ ہے۔''

سوال: محترمہ! یہ بتائے کہ آپ افسانے کے کرداروں کا چناؤ کس طرح کرتی ہیں یعنی یہ تخیلاتی ہوتے ہیں یا عام زندگی سے؟

جواب: میں افسانہ گھڑتی نہیں ہوں اس لئے کردار بھی خود نہیں بناتی بس جو کچھ دیکھا بھالا ہوتا ہے وہی بیان کرتی ہوں۔''

سوال: آپ افسانہ ایک نشست میں لکھتی ہیں یا کئی نشستوں میں؟

جواب: یہ حالات پر منحصر ہے۔۔۔افسانہ لکھتے ،لکھتے کوئی مہمان آ گیا۔کسی بچے کی طبیعت خراب ہوگئی ۔گرم چولہے پر رکھی ہوئی ہنڈیا جلنے لگی۔ چائے بنانے کا وقت آ گیا تو قلم کاغذ کو ایک طرف رکھ دیا۔لیکن کبھی تو ایک نشست میں دو دو افسانے بھی ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی مختصر سا افسانہ بھی کئی نشستوں میں تکمیل کی حد تک مشکل سے ہی پہنچتا ہے۔

سوال: صوبہ سرحد میں لکھنے والی خواتین کے مستقبل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: صوبہ سرحد میں رسائل اور اخبارات کی کمی کے پیش نظر یہاں کی خواتین کی ادبی کاوشوں پر تبصرے سے سردست معذور ہوں اپنا احوال یہ ہے کہ میں اور تاج اپنی آمدن میں سے کچھ نہ کچھ پس انداز کرتے رہتے ہیں۔اس طرح برس دو برس میں ایک آدھ کتاب چھاپ دیتے ہیں۔لیکن کسی اور میں اتنی

جرأت نہیں پا رہی ہوں۔"

سوال: ادیب اور شاعر کو ملکی سیاست میں حصہ لینا چاہیئے یا نہیں؟

جواب: احمد صاحب! میں سیاست کے معاملہ میں نابلد ہوں۔لہذا اس سلسلہ میں کچھ کہہ نہیں سکتی؟

سوال: آپ جب گھر پر ہوتی ہیں تو بالکل ایک گھریلو اور دیہاتی خاتون لگتی ہیں اپنے کپڑے خود دھوتی ہیں۔گھر کی صفائی، دھلائی کرتی ہیں، سلائی کڑھائی اور کھانا پکانے میں عار نہیں سمجھتیں؟

جواب: قطعی نہیں بلکہ اپنے گھر کا کام کرنے میں فخر محسوس کرتی ہوں میں اپنی بیٹیوں کو بھی یہی تربیت دے رہی ہوں اسی لئے تو کوئی ملازمہ بھی نہیں رکھی ہے۔"

سوال: کیا آپ شروع سے اپنے علاقے کے رواج اور علاقائی تہذیب کے مطابق چادر اوڑھتی آئی ہیں یا کبھی برقعے کا استعمال بھی کیا ہے؟

جواب: جب برقعے کا رواج تھا تو برقع اوڑھا پھر چادر نے رواج پایا تو چادر اپنائی۔بی اے میں اسلامیات کے مطالعہ میں قرآن مجید اور احادیث میں نقاب والے برقع کا ذکر کہیں نظر نہیں آیا۔جب ٹیلی ویژن عام ہوا تو بڑے غور سے جائزہ لیا کہ حج بیت اللہ شریف کے موقع پر جبکہ ملکوں ملکوں کی مسلمان خواتین جمع ہوتی ہیں۔وہ اسلامی شریعت کے تحت کس نوعیت کا پردہ کرتی ہیں۔لیکن وہاں بھی برقع اور نقاب کی پابندی نظر نہیں آئی چنانچہ اب مکمل طور پر چادر اپنا لی ہے۔میری بیٹیاں بھی چادر اوڑھتی ہیں۔میں سمجھتی ہوں کہ اسلامی پردے کی رو سے چادر روائتی برقعے کے مقابلے میں زیادہ اسلامی ہے۔"

سوال: محترمہ! آپ ریڈیو پاکستان سے وابستہ رہی ہیں۔ڈرامہ آرٹسٹ اور کمپیئرنگ کے فرائض بھی انجام دیئے ہیں۔اس کے علاوہ ڈرامے بھی تحریر کئے ہیں۔کیا ان باتوں کے بارے میں کچھ بتانا مناسب سمجھیں گی؟

جواب: ریڈیو فنکارہ کی حیثیت سے ابتداء بچوں کے پروگرام سے ہوئی اب ریڈیو کی اے ون آرٹسٹ ہوں ریڈیو پروڈیوسر بھی رہ چکی ہوں۔لکھنے کا آغاز ڈرامے سے کیا تھا۔"

سوال: آپ کے خیال میں ریڈیو کے ایک بہترین پروڈیوسر کی کیا خوبی ہوتی ہے؟

جواب: ریڈیو کے پروڈیوسر کی بنیادی خوبی اس کا ادیب اور شاعر ہونا ہے یا کم از کم ادبی اصناف پر اس قدر دسترس حاصل ہو کہ سکرپٹ میں ترمیم واضافہ کر سکے یا لکھنے والے سے کہہ کر کمی بیشی کروا سکے۔ریڈیو پروڈیوسر کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ وہ پیش کئے جانے والے پروگرام کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو۔سننے والوں کی پسند ناپسند کا خیال رکھنا بھی پروڈیوسر کی ایک صفت ہے۔اپنے کام سے لگن اور

دلچسپی ہو وقت کا پابند ہو۔ صدا کاروں اور آرٹسٹوں کی عزت کرنا جانتا ہو لیکن اقربا پرور اور دوست نواز نہ ہو۔ صدا کاروں سے کام لینا جانتا ہو۔ آوازوں کا چناؤ درست کر سکتا ہو۔ کبھی کبھار صدا کاروں اور اداکاروں کی ناز برداریاں بھی اٹھانے کی سکت رکھتا ہو لیکن کسی کو مغرور ہونے کا موقع نہ دیتا ہو پروڈیوسر صحیح معنوں میں لکھا پڑھا اور سمجھدار ہوگا تو کوئی وجہ نہیں کہ ریڈیو اور ٹی وی پر پیش کئے جانے والے پروگرام معیاری نہ ہوں۔"

سوال: آپ کے خیال میں پشاور ریڈیو کے بہترین پروڈیوسر کون کون رہے ہیں؟

جواب: میری نظر میں 1948ء سے حمید اصغر صاحب، عمر ناصر صاحب اور نواب علی صاحب یہ سب فرض شناس، محنتی اور لگن سے کام کرنے والے بہترین پروڈیوسر تھے۔

سوال: آپ درس و تدریس سے متعلق ہیں۔ تعلیمی افادیت کی روشنی کے نظریہ کے لئے آپ نے تعلیم نسواں کے لئے (عملی طور پر) کیا فرائض انجام دیئے ہیں؟

جواب: میں نے قلم اس نظریہ کے تحت اٹھایا ہے کہ اگر ماں تعلیم یافتہ ہوگی تو اولاد بھی سلجھی ہوئی نسل بنے گی ورنہ معاملہ الٹا ہوگا۔

سوال: پاکستانی معاشرے کی تشکیل کے لئے قوم کے نونہالوں کی طرف بھی آپ نے توجہ دی یا نہیں اگر ماں ہیں تو بہبودی اطفال کے لئے آپ نے کیا کام کیا ہے؟

جواب: ماشاءاللہ چار بچوں کی خاطر ہی اچھی اچھی ملازمتیں ٹھکرائی ہیں تا کہ اپنے بچوں اور بچیوں پر توجہ دے سکوں۔ گھر مجھے بہت پیارا ہے میرے اپنے بچے تو قوم کا سرمایا ہیں۔ اتنی بڑی قربانی محض اس واسطے نہیں دی ہے کہ میں ایک ماں ہوں بلکہ ایک ترقی پذیر معاشرے کی ایک ذمہ دار فرد ہوں۔ درس و تدریس کا راستہ اسی کے تحت اختیار کیا ہے۔ والدین کو بچوں کی تربیت کے سلسلے میں اپنے تجربات مضامین کی صورت میں اکثر و بیشتر پیش کرتی ہوں بچوں کی نفسیات پر لکھنا میرا پسندیدہ مشغلہ ہے اس سلسلہ میں اس موضوع پر متعدد مضامین لکھے ہیں جنہیں کتاب کی صورت میں چھاپنے کا ارادہ ہے۔

سوال: پاکستانی عورت اور اس کے عملی کردار کے بارے میں آپ کیا نظریہ رکھتی ہیں۔

جواب: پاکستانی عورت بڑی محنتی اور جفاکش ہے۔ لیکن مردوں نے اسے پابند سا کر رکھا ہے اور اس سے اظہار رائے کا حق بھی چھینا ہوا ہے تو وہ کیا کردار ادا کر سکتی ہے۔"

سوال: جمہوریت پر ہر ذی شعور انسان یقین رکھتا ہے آپ کے خیال میں جمہوریت کے پھلنے پھولنے کے لئے کس چیز کی ضرورت ہے۔

حق گو صحافت

بیباک تعمیری تنقید

یا اور

''آزادیٔ تحریر؟''

جواب: جمہوریت میں ذہنوں کو نہیں بلکہ سروں کو اولیت دی جاتی ہے۔ آدمی تولے نہیں جاتے گنے جاتے ہیں۔ جمہوریت میں اب تک ذی شعور انسان کا کوئی درجہ نہیں آیا بھلا اس صورت حال میں حق گو صحافت، بیباک تعمیری، تنقید اور آزادیٔ تحریر قسم کی اصلاحات اپنی سمجھ سے بالا ہیں۔ ہاں جمہوریت کا مفہوم مجھے پسند ہے لیکن جمہوریت کی کوئی عملی شکل نظر نہیں آئی۔''

سوال: ادب سے کیا مراد ہے؟

اس کی اہمیت و افادیت انسانی زندگی کے کونسے پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں نیز روایتی اور جدید رجحانات و میلانات کا باہم ناطہ کیا ہے۔ اس طرح کے بیشتر سوالات مختلف ادوار کے ادباء شعراء کے سامنے اٹھائے گئے ہیں۔ آج میں آپ کے سامنے یہ سوالات اٹھا رہا ہوں۔''

جواب: نئی سمت ڈھونڈنا ادب کی ایک صفت ہے لیکن اس کا ناطہ روایت کے ساتھ مربوط رہتا ہے۔ کیونکہ انسانی مزاج اور فطرت ہر زمانے میں برابر رہے ہیں۔ حالات واقعات کی تبدیلی سے انسانی خیالات تو ضرور متاثر ہوتے ہیں اور رجحانات بدلتے ہیں مگر اس کی اہمیت اور افادیت یکساں رہتی ہے۔ بایں ہمہ بامقصد ادب زندگی کی علامت ہوتا ہے۔ وہ انسانوں کو متحرک کرتا ہے اور ان کے اندر جدوجہد کا جذبہ بیدار کرتا ہے۔

حواشی

1۔ ہفت روزہ ''اخبار جہاں'' کراچی، 18 مئی تا 24 مئی 1981ء، ص 16
2۔ سہ ماہی سیارہ لاہور، (شیشم کا پتا) مارچ 1977ء، ص 288
3۔ زیتون بانو فن اور شخصیت، احمد پراچہ، ص 115,114
4۔ مات ہنکوری، زیتون بانو، ص 72
5۔ دھول، برگ آرزو، زیتون بانو، ص 8
6۔ منجیلہ، اس کپڑے کو کہتے ہیں جو پانی کا گھڑا یا کوئی ٹھوس بوجھ سر پر لگانے کے لئے استعمال ہوتا ہے اسے باقاعدہ بل دے کر مروڑ کر سیا جاتا ہے۔
7۔ سیلابی ریلے میں بہنے والے بڑے تنکے جن کو ضرورت مند لوگ اکٹھا کر کے ایندھن کے طور پر استعمال کرتے ہیں، نیز وڑے کہلاتے ہیں۔
8۔ روزنامہ جنگ لاہور، پرچہ 21 ستمبر 1984، انٹرویو رحیم گل، فارغ بخاری، خاطر غزنوی
9۔ منجیلہ، دانش کتب خانہ پشاور 2006، ص 3
10۔ منجیلہ، بانو کا شعری مجموعہ، ص 4
11۔ بخیہ ریشمی، افضل رضا، ص 232
12۔ بخیہ ریشمی، افضل رضا، ص 239
13۔ قند ڈراما نمبر، ص 291
14۔ قند ڈراما نمبر، ص 289
15۔ دقند ہندارہ، ص 285,284
16۔ ہندارہ، ص 6

17۔ زلندہ ستوری، ص256

18۔ کچکول، ص10,8

19۔ پتجہ شمعی (پانچ شمعیں)، ص285

20۔ پنزہ شمعے، افضل رضا، ص287

21۔ مجیلہ، مقدمہ، مرتبہ، اباسین یوسفزئی، (بانو کا پشتو شعری مجموعہ)، صفحہ 11,10

22۔ روز نامہ مشرق پشاور، (لاہور نامہ) 3 جولائی 1976

23۔ یہ مضمون فارغ بخاری مرحوم نے اگست 1979ء میں پاکستان رائٹرز گلڈ سرحد کی ادبی نشست میں پڑھا تھا۔ جو زیتون بانو کے اعزاز میں منعقد ہوئی تھی۔

24۔ ماہنامہ کتاب، ستمبر 1976

25۔ ماہنامہ کتاب، لاہور، ستمبر 1976، ص6

26۔ کالم "دل پشوری" روزنامہ آج پشاور، 18 ستمبر 1996

27۔ بانو کا فن اور شخصیت، مضمون، ڈاکٹر سلمیٰ شاہین

28۔ مضمون از عبداللطیف پریشان، روزنامہ مشرق پشاور، 9 دسمبر 1976

29۔ ہفت روزہ "اخبار جہاں" کراچی، 1976، ص19

30۔ حلقہ ارباب ذوق کا اجلاس، بمقام پاکستان نیشنل سنٹر پشاور

31۔ حلقہ ارباب ذوق کا اجلاس، 16 جولائی 1976، رپورٹ، روزنامہ مشرق پشاور

32۔ ہفت روزہ شہاب، راولپنڈی، 18 جولائی 1976

33۔ روزنامہ امروز، لاہور، 28 جولائی 1976

34۔ روزنامہ حریت، کراچی، 2 اگست، 1976

35۔ ہفت روزہ اخبار جہاں، لاہور کی ادبی سرگرمیاں، 4 تا 11 اگست 1976

36۔ روزنامہ مساوات، لاہور، 30 اگست 1976، سنڈے ایڈیشن

37۔ سہ ماہی ادبیات اسلام آباد، خصوصی شمارہ (پاکستانی اہل قلم خواتین) جنوری تا جون 2007ء

38۔ روزنامہ مساوات، کراچی، 15 نومبر 1976

39۔ روزنامہ امروز، لاہور، 16 نومبر 1976

40- روزنامہ ''افکار'' کراچی، دسمبر 1976، ص 49
41- ماہنامہ السیف، اسلام آباد، جنوری 1977
42- ماہنامہ ''احساس'' پشاور، فروری 1977، ص 92
43- ماہنامہ تخلیق، ص 83,81
44- کتاب، زیتون بانو، فن اور شخصیت، مولف احمد پراچہ، ص 125
45- کتاب زیتون بانو فن اور شخصیت، ص 18,17,14، ترتیب و تالیف احمد پراچہ
46- کتاب زیتون بانو فن اور شخصیت، ص 92
47- زیتون بانو شخصیت اور فن، ص 92 تحریر و تالیف احمد پراچہ
48- زیتون بانو شخصیت اور فن، ص 98 تحریر و تالیف احمد پراچہ
49- زیتون بانو فن اور شخصیت، تحریر و تالیف احمد پراچہ، ص 104,103
50- زیتون بانو فن اور شخصیت، تحریر و تالیف احمد پراچہ، ص 113
51- خانہ فرہنگ، ایران میں پڑھے گئے مضمون سے اقتباس (محسن احسان
52- پیش لفظ شیشم کا پتا، ص 14 (ڈاکٹر اعجاز راہی)
53- خوبونہ، ص 8
54- ھنداره، تعارف، ص (ر) زیتون بانو
55- خوبونہ، ص 9، زیتون بانو
56- جدید پشتو ادب، ایوب صابر، ص 274
57- مات بنگڑی، زیتون بانو، ص 11
58- پختو افسانہ، ڈاکٹر اعظم اعظم، ص 147
59- پیزوشمے، افضل رضا، ص 255

کتابیات

1۔ زیتون بانو، فن اور شخصیت، احمد پراچہ، 1974ء، مکتبہ ارژنگ پشاور

2۔ پورٹریٹ، رحیم گل، 1979ء، مکتبہ ارژنگ پشاور

3۔ ادبیات، اکادمی ادبیات پاکستان، جنوری تا جون 2007ء

4۔ پیژہ شمعے، پروفیسر افضل رضا، 2006ء، پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی

5۔ ہندارہ، زیتون بانو، 1958ء، ادارہ اشاعت سرحد، پشاور

6۔ مات بنگڑی، زیتون بانو، 1981ء، مکتبہ ارژنگ پشاور

7۔ ژوندی غمونہ، زیتون بانو، 1989ء، یونیورسٹی بک ایجنسی

8۔ شیشم کا پتہ، زیتون بانو، 1976ء، مکتبہ ارژنگ پشاور

9۔ خوبونہ، زیتون بانو، 1986ء، مکتبہ ارژنگ پشاور

10۔ نیزہ وڑے، زیتون بانو، 2007ء، دانش کتب خانہ پشاور

11۔ زما ڈائری، زیتون بانو، 2007ء، دانش کتب خانہ پشاور

12۔ مجیلہ، زیتون بانو، 2006ء، دانش کتب خانہ، پشاور

13۔ پختو د دولسم دپارہ، پشتو اکیڈمی یونیورسٹی، ٹیکسٹ بک بورڈ پشاور

14۔ وقت کی دہلیز پر، زیتون بانو، 1982ء، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

15۔ کچکول، زیتون بانو، 1991ء، مکتبہ ارژنگ پشاور

16۔ برگِ آرزو (دھول)، زیتون بانو، 1984ء، سنگ میل پبلی کیشنز پشاور

17۔ زندہ دکھ، زیتون بانو، 1998ء، مقبول اکیڈمی لاہور

18۔ تورسری، تحقیق اور ترتیب، ڈاکٹر سلمیٰ شاہین، 2005ء، پشتو اکیڈمی یونیورسٹی

19۔ نیزہ وڑے، زیتون بانو، زیر طبع

20۔ زماڈائری، زیتون بانو، زیرطبع

1۔ روزنامہ ''آج'' پشاور، 11 ستمبر 1996

2۔ روزنامہ ''آج'' 18 ستمبر 1996

3۔ روزنامہ ''آج'' 19 ستمبر 1996

4۔ ہفت روزہ ''اخبار جہاں'' کراچی، 18 تا 26 مئی 1981

5۔ ہفت روزہ ''اخبار جہاں'' 26 جنوری تا یکم فروری 1987

6۔ اخبار خواتین، 11 تا 17 نومبر 1978

7۔ ماہنامہ ''احساس'' پشاور، فروری 1977

8۔ ماہنامہ ''افکار'' کراچی، دسمبر 1976

9۔ ماہنامہ ''السیف'' اسلام آباد، جنوری 1977

10۔ ہفت روزہ ''امروز'' لاہور، 28 جولائی 1976ء

11۔ ہفت روزہ ''امروز'' لاہو 25 اگست 1978ء

12۔ ہفت روزہ ''امروز'' لاہور 16 نومبر 1976ء

13۔ پاکستان ٹائمز لاہور، 3 جنوری 1977

14۔ پلک (ماہنامہ)

15۔ تخلیق (ماہنامہ)، مارچ 1977

16۔ جہاد (روزنامہ) 11 ستمبر 1996

17۔ جہاد (روزنامہ) 22 ستمبر 1996

18۔ جہاد (روزنامہ) 21 ستمبر 1996

19۔ حریت کراچی روزنامہ، 2 اگست 1976ء

20۔ حریت کراچی روزنامہ، 2 ستمبر 1976ء

21۔ سیارہ ڈائجسٹ لاہور (سہ ماہی) مارچ 1977

22۔ سیارہ ڈائجسٹ لاہور (سہ ماہی) نومبر 1976

23۔ شہاب راولپنڈی (ہفت روزہ)، 18 جولائی 1976

24۔ فنون لاہور، نومبر دسمبر 1976

25۔ فرنٹیئر پوسٹ پشاور، 24 اپریل 1982

26۔ فرنٹیئر پوسٹ پشاور، 8 ستمبر 1996

27۔ مساوات لاہور سنڈے ایڈیشن، 3 اگست 1976

28۔ مساوات روزنامہ، 22 جولائی 1976

29۔ مساوات روزنامہ، 9 جولائی 1976

30۔ مساوات کراچی (روزنامہ) 15 نومبر 1976

31۔ مشرق (پشاور) روزنامہ، 16 جولائی 1976

32۔ مشرق (پشاور) روزنامہ، 9 دسمبر 1976

33۔ مشرق (پشاور) روزنامہ، 3 جولائی 1976

34۔ مشرق (پشاور) روزنامہ، 14 کتوبر 1981

35۔ مارننگ نیوز، 19 ستمبر 1977

36۔ مارننگ نیوز، 6 جولائی 1976

37۔ کتاب (لاہور) ماہنامہ، ستمبر 1976

38۔ کسوٹی، 25 جون 1996

پیشِ خدمت ہے "کتب خانہ" گروپ
کی طرف سے ایک اور کتاب

پیشِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔ گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
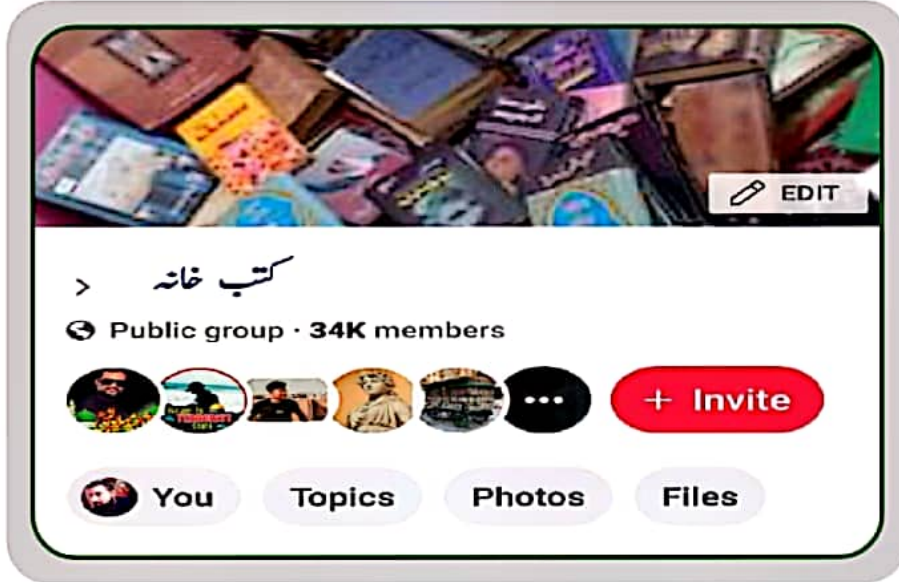
عقابی : +923055198538

محمد اطہر اقبال : +923340004895

محمد قاسم : +971543824582

میاں شاہد عمران : +923478784098

میر ظہیر عباس روستمانی : +923072128068